© rasailojaraid.com

لوگوں پر حق واضح ہو اور جماعتی زندگی کا نظام اسی لیے اختیار کیا ہے کہ ایک کی مضبوطی دوسرے کی کمزوری کا ازالہ کرنے میں معین ہو اور باہمی تعاون سے وہ سرگرمی اور جدوجہد وجود میں آسکے جو اس وقت حق کی خدمت کے لیے مطلوب ہے۔ اب یہ آپ کا کام ہے کہ آپ میں طلب علم کی رغبت پیدا ہو اور جماعتی زندگی کی برکتیں حاصل کرنے کی کوشش کریں لیکن ہم کو سخت حیرت ہوتی ہے کہ لوگ خود اپنی ذمہ داریوں کی نسبت بھی یہی خواہش رکھتے ہیں کہ مرکز ہی ان کو بھی پورا کرے۔ لٹریچر شائع کر کے لوگوں میں علم پیدا کرے اور پھر ہاتھ پاؤں بن کر ان کے ذمہ کے عمل کو بھی پورا کر دے۔ جو لوگ اس طرح کی خواہشیں اپنے دل کے اندر رکھتے ہیں ان کو اس امر سے آگاہ ہونا چاہیے کہ جو کام ان کے کرنے کے ہیں انہی کو کرنے ہوں گے۔ اور وہ کام صرف تمنائیں کرنے سے نہیں بلکہ کرنے سے پورے ہوں گے۔ ہم کو کوئی ایسا افسوں نہیں معلوم ہے جو ہم یہاں سے بیٹھے بیٹھے پھونک دیں اور سارے کام بن جائیں۔ ہم حق کو واضح کر سکتے ہیں اور اس کی خدمت کے لیے اپنا حصہ پورا کر سکتے ہیں، لیکن دوسروں کے اندر اس کے لیے ہمت پیدا کرنا ہمارے اختیار سے باہر ہے۔

بعض لوگوں کے اندر یہ خواہش بھی پائی جاتی ہے کہ جماعت کے کاموں کی رفتار تیز کرنے کے لیے کسی تیز رو جماعت کے ساتھ تعاون کر لیا جائے اگرچہ اس کی تیزروی کسی سمت میں ہو۔ جن لوگوں کے دماغوں میں اس طرح کی باتیں آتی ہیں وہ لوگ ابھی جماعت اسلامی کے مزاج سے بہت دور ہیں ان کو چاہیے کہ وہ جماعت کے لٹریچر کا اچھی طرح مطالعہ کریں تاکہ ان کے دماغ کی الجھنیں دور ہوں۔ ہم کو صرف تیزروی مطلوب نہیں ہے بلکہ صحیح سمت میں تیزروی مطلوب ہے۔ کسی غلط سمت میں تیزروی سے ہمارے نزدیک یہ بہتر ہے کہ آدمی صحیح سمت کی طرف رخ کر کے کھڑا رہے۔ جو شخص کسی غلط راہ پر تیزی کے ساتھ بھاگا جا رہا ہے اس کی حالت پر رشک کرنا حماقت اور اس کو لائق تقلید جاننا ہلاکت ہے۔ جن لوگوں کے دماغوں میں اس طرح کے خیالات گزرتے ہیں ان کے لیے جماعت اسلامی میں داخل ہونے سے زیادہ بہتر یہ تھا کہ ابھی وہ تیز رو جماعتوں کی تیزروی کا کچھ دنوں اور تجربہ کرتے۔ اس کے بعد اگر وہ ہمارے ساتھ آتے تو شاید ہمارے لیے زیادہ زحمت کا سبب نہ بنتے۔

مخالفتوں کا خیر مقدم

یہ نہایت خوشی کی بات ہے کہ ہمارے ارکان میں مخالفتوں سے جو مرعوبیت تھی وہ بہت کم ہو رہی ہے۔ اب لوگوں میں مزاحمتوں کا مقابلہ کر کے آگے بڑھنے کی ہمت پیدا ہو رہی ہے۔ یہ جماعتی زندگی کی برکت ہے اور اس برکت کا ظاہر ہونا اس بات کی شہادت ہے کہ ہماری جماعتی زندگی کا ارتقاء صحیح رخ پر ہو رہا ہے۔ لیکن یہ معلوم ہونا چاہیے کہ ہم جس راہ پر چلنے کے لیے اٹھے ہیں اس راہ میں صرف یہ کافی نہیں ہے کہ مخالفتوں سے مرعوبیت کم ہو جائے یہ تو اس راہ کا پہلا مطالبہ ہے۔ اس کے بغیر تو آپ اس راستہ میں ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتے۔ اس راہ کا اصل مطالبہ اس سے بہت زیادہ ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم میں مخالفتوں کے خیر مقدم کا جذبہ پیدا ہو جائے۔ حق کا راستہ ہو یا باطل کا، اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ جو شخص جس راہ کو اختیار کرتا ہے اس راہ میں اس کی آزمائش ہوتی ہے اور راہ حق کا تو امتیازی نشان ہی یہ ہے کہ وہ شروع سے آخر تک آزمائشوں سے بھری ہوتی ہے۔ جس طرح ریاضی کا ایک ذہین طالب علم کسی مشکل سوال سے خوش ہوتا ہے کہ اس کو اپنی جودت طبع کے آزمانے کا ایک اور موقع ہاتھ آیا اسی طرح ایک صادق العزم مومن کو کسی نئی آزمائش سے مقابلہ کر کے خوشی ہوتی ہے کہ اس کو حق کے ساتھ اپنی وفاداری کے ثبوت دینے کا ایک اور موقع بہم پہنچا۔ ٹمٹماتے ہوئے دیئے بے شک ہوا کے جھونکوں سے گل ہو جاتے ہیں لیکن بھڑکتے ہوئے تنور کو ہواؤں کے جھونکے اور زیادہ بھڑکا دیتے ہیں۔ اب اپنے اندر یہ صلاحیت پیدا کیجیے کہ جس طرح ایک بھڑکتا ہوا تنور گیلی لکڑیوں سے بجھنے کے بجائے ان کو اپنی غذا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بنا لیتا ہے اسی طرح آپ مخالفتوں سے دبنے کے بجائے ان سے غذا اور قوت حاصل کریں۔ جب تک ہم میں یہ قابلیت نہ پیدا ہو جائے امید نہیں کہ ہم خدا کے دین کی کوئی اچھی خدمت کر سکیں۔

آپ نے جن مخالفتوں کا ذکر کیا ہے وہ مختلف قسم کی ہیں لیکن ان میں سے ڈرنے کی چیز ایک بھی نہیں۔ دنیا میں حق کی خدمت کے لیے جو جدوجہد بھی کبھی ظہور میں آئی ہے اس کے ساتھ یہ مخالفتیں بھی آپ سے آپ پیدا ہوئی ہیں اور قرآن نے ہمیں یہ تعلیم دی ہے کہ ان کا پیدا ہونا عین حکمت الٰہی کے مطابق ہے۔ یہی مومن صادق اور بوالہوس کے درمیان امتیاز کی کسوٹی ہیں اور انہی سے پیروؤں کے اندر انسان کے اختیار کی آزمائش ہوتی ہے۔ پس ان مخالفتوں سے ہراساں ہونے کی ضرورت نہیں ہے البتہ اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرنی چاہیے کہ وہ ہر مرحلہ میں ہمیں ثابت قدم رکھے اور ہمارے عزم و ایمان کی محافظت فرمائے۔

ایک سوال کا جواب

جماعت کے ارکان میں ایک عام سوال یہ بھی پایا جاتا ہے کہ جب جماعت اسلامی کی دعوت تمام تر اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت سے ماخوذ ہے بلکہ سرتاسر کتاب و سنت کی پیروی ہی کی دعوت ہے اور مخالفین بھی باوجود انتہائی سعی کے اب تک اس کی کوئی بات کتاب و سنت کے خلاف نہیں ثابت کر سکے ہیں تو آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ مسلمان اس کو قبول کرنے میں اتنی دیر لگا رہے ہیں۔ یہ سوال ہم میں سے بہتوں کو حیرانی میں ڈالے ہوئے ہے اور بسا اوقات دوسروں کی اس بے پروائی کی وجہ سے ہم میں سے بعضوں کی نظر میں وہ حق بے وقعت ہو جاتا ہے جو خود ان پر منکشف ہو چکا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اس سوال پر غور کیا جائے۔ ہم نے جہاں تک غور کیا ہے اس خالص دینی دعوت سے مسلمانوں کی بے پروائی کے اسباب نہایت گہرے ہیں۔ مسلمان اپنی موجودہ حالت تک ایک دو دن میں نہیں پہنچے ہیں۔ ان کو درجہ بدرجہ اس حالت تک لایا گیا ہے اور ہر منزل میں ان کو از روئے کتاب و سنت یہ اطمینان دلانے کی کوشش کی گئی ہے کہ یہی حالت آج اسلام و ایمان کا تقاضا ہے۔ ان کے حق سے انحراف پر ایک طویل زمانہ گزر چکا ہے اور اس غلط راہ کے ہر موڑ پر انہوں نے دم لے کر یہ سمجھ کر قیام کیا ہے کہ یہ عین دین و شریعت کی صراط مستقیم ہے اور ان کی اس غلط فہمی کے راسخ کرنے میں ارباب دین نے حصہ لیا ہے اور اس بے راہ روی کے نہ صرف جواز بلکہ استحسان پر ضخیم فقہی اور کلامی تصنیفات مرتب کر دی گئی ہیں یہاں تک کہ ان کو یقین ہے کہ ان کا جو قدم بھی اٹھا ہے وہ شریعت کے دائرہ کے اندر اٹھا ہے اور آج بھی جہاں وہ ہیں شریعت ہی کا ایک مقام ہے اس سے الگ نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ جس جماعت کو اس طرح درجہ بدرجہ گرایا گیا ہو جس کا گرنا اس طرح مخفی ہو جس کے زوال کی تاریخ اتنی لمبی ہو جس کو یہ یقین دلایا گیا ہو کہ اس کا یہ گرنا گرنا نہیں بلکہ اچھلنا ہے، جو اس غلط فہمی میں ہو کہ وہ اپنی موجودہ حالت میں بھی شریعت سے الگ نہیں بلکہ عین شریعت کے مطابق ہے وہ آپ کی دعوت کو کس طرح آسانی کے ساتھ قبول کر سکتی ہے جو ان سے کسی جزئی ترمیم و اصلاح کا مطالبہ نہیں کرتی بلکہ ان سے سچی توبہ اور کامل اصلاح کا مطالبہ کرتی ہے۔ جب آپ ان سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ یا ایھا الذین آمنوا آمنوا اے وہ لوگو جو ایمان کے مدعی ہو حقیقی ایمان لاؤ، اور ان کے اعمال سے لے کر ان کے عقائد تک میں رخنے بتاتے ہیں تو قدرتی طور پر ان کو اس بات سے چوٹ لگتی ہے اور ان کی دینداری کا دیرینہ پندار اس سے مجروح ہوتا ہے۔ وہ یہ بات آسانی کے ساتھ ماننے کے لیے تیار نہیں ہو سکتے کہ وہ آج تک ایک بالکل غلط راہ پر بھاگ رہے تھے۔ انسان کی یہ فطرت ہے کہ وہ اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ الاؤنس کا مستحق سمجھتا ہے اور مسلمانوں کو تو یہ غلط فہمی بھی ہے کہ اسلام ایک آسان دین ہے جس کو ہر حالت کے مطابق کیا جا سکتا ہے اس وجہ سے وہ تنگ راہ جو آپ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ان کے سامنے پیش کرتے ہیں، اس پر آنے سے جو گھبراتے ہیں اور بِدکتے ہیں، اگرچہ وہ حالت بھی دینداری سے الگ نہیں ہے جو انھوں نے اختیار کر رکھی ہے تو بلا وجہ زندگی کو قیدوں میں گھیرنے سے کیا فائدہ؟ پس جب تک کہ آپ ان پر یہ بات پوری طرح واضح کر دیں کہ ان کی موجودہ زندگی اسلام سے بالکل بے ربط ہو گئی ہے اور اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے لیے ان کے دلوں کو اپنے دلائل سے کھول بھی نہ دیں اس وقت تک توقع نہیں کہ وہ ہماری دعوت قبول کرنے پر آمادہ ہوں۔ لیکن یہ کام آسان نہیں ہے۔ اس کو ہر شخص انجام نہیں دے سکتا۔ ہماری دعوت کے اسی پہلو سے لوگ گھبراتے ہیں اور اس سے سخت غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں اور مخالفین کو یہیں سے لوگوں کو ہمارے خلاف بھڑکانے کا مواد ہاتھ آتا ہے۔ اس وجہ سے نہایت ضروری ہے کہ ہم ہماری جماعت کے افراد دعوت کے اس پہلو کو اچھی طرح سمجھ لیں اور جو لوگ اس کو اچھی طرح نہ سمجھے ہوں وہ کم از کم اس پہلو پر لوگوں سے زیادہ گفتگو کرنے میں احتیاط کریں تاکہ بلا وجہ ہمارے کام میں رکاوٹیں نہ پیدا ہوں۔

علماء کی بے پروائی ہماری دعوت سے عام مسلمانوں کی بے پروائی کی وجہ یہ ہے۔ رہے علماء، تو ان کی نسبت ہر شخص جانتا ہے کہ یہی حضرات ہیں جنھوں نے مسلمانوں کی ان کی موجودہ [illegible] دینداری اور تقویٰ، اسلام اور ایمان [illegible] کا موجودہ مفہوم جو عوام کے ذہنوں میں ہے، سب انھی کا پیدا کیا ہوا ہے۔ یہ لوگ نیک نیتی کے ساتھ یہ سمجھتے ہیں کہ یہی ہیں جنھوں نے تمام [illegible] مصائب کے اندر سے وہ اسلام کو بچا لائے اور آج بھی اس کو بچائے ہوئے ہیں۔ ایسے لوگوں سے جو اتنی بڑی خوش گمانیوں میں مبتلا ہوں آپ یہ کیسے توقع کر سکتے ہیں کہ آج وہ کھلے دل سے اس بات کا اقرار کریں گے کہ آج تک انھوں نے جو رہنمائی کی ہے وہ غلط اور صحیح راہ وہ ہے جس کی دعوت فلاں جماعت دے رہی ہے۔ بلا شبہ حق پرستی کا تقاضا یہی ہے کہ اس صاف حقیقت کے اقرار سے ان کو شرم نہ آئے۔ قرآن نے اہل حق کی سب سے بڑی خوبی یہی بتائی ہے کہ وہ حق کے اعتراف و اعلان میں ملامت کرنے والوں کی ملامت کی پروا نہیں کیا کرتے لیکن انسانی فطرت کی کمزوریاں جس طرح عوام کے اندر پائی جاتی ہیں اسی طرح خواص کے اندر بھی چھپی ہوتی ہیں۔ جس طرح ہمارے عوام کا پندار دینداری ان کو اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ تجدید ایمان کے ننگ کو گوارا کریں اسی طرح [illegible] خواص کا غرور سیادت ان کو اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ اپنے منہ سے خود اپنی غلط رہبری کا اقرار کریں۔ وہ ایک غلط سمت میں اتنی دور تک نکل گئے ہیں کہ ان کے لیے وہاں سے پلٹنا آسان نہیں رہا ہے۔ یہ حقیقت بھی پیش نظر رکھنی چاہیے کہ احساس دینداری کا فتنہ دنیاداری کے فتنہ سے زیادہ سخت ہوتا ہے۔ جو لوگ کسی نفس پرستی میں دنیاداری کی راہ سے مبتلا ہوتے ہیں جب بھی ان کے دل پر حق کی تجلی پرتو فگن ہوتی ہے ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں اور صحیح راہ ان پر آشکارا ہو جاتی ہے۔ ان کی رکاوٹیں زیادہ تر سستی اور پست ہمتی کی قسم کی ہوتی ہیں جو دل کی معمولی بیداری سے بھی دور ہو جاتی ہیں لیکن جو حضرات اپنی غلطیوں کو دین و تقویٰ بنا کر ان کی پرستش کرتے اور کراتے رہتے ہیں ان کے لیے اپنے بنائے بتوں کو توڑ پھوڑ کر ایک نیا دین اختیار کر لینا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ یہی تو وہ حجاب اکبر ہے جس کے [illegible] بہت کم بچتے ہیں اور اس بات پر تعجب نہیں کرنا چاہیے کہ اس کمزوری میں ہمارے علماء بھی مبتلا ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کے لیے [illegible] بھی [illegible] ان کے لیے [illegible] ایک امید [illegible] ہے۔

[illegible] حضرات [illegible]

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کا اقرار ہے کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں اسلام کا اصلی مطالبہ یہی ہے لیکن چونکہ ان کا دل اس کو ماننے پر راضی نہیں ہے اس وجہ سے اس کے خلاف کچھ باتیں بتکلف بناتے ہیں۔ اور پڑھے لکھے لوگ اگر کسی آفتاب سے زیادہ روشن حق کے خلاف بھی کچھ کہنے پر آمادہ ہو جائیں تو کچھ نہ کچھ اس میں رخنہ نکال ہی دیں گے۔ چنانچہ یہ حضرات بھی کچھ نہ کچھ باتیں پیدا ہی کر لیتے ہیں۔ اگر اصلی دعوت کے خلاف ان کو کوئی بات نہیں ملتی تو داعی کے اندر ہی کچھ عیب ڈھونڈھ نکالتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہرچند دعوت عین کتاب و سنت کی دعوت ہے لیکن داعیوں پر چونکہ بھروسہ نہیں ہے اس وجہ سے ان کے پیچھے چلنے کے بجائے فلاں اور فلاں کے پیچھے چلو جن کی دعوت میں اگرچہ غلطی ہو لیکن وہ خود متقی اور بھروسہ کے قابل ہیں۔ یہ کتنی درد انگیز اور دل شکن بات ہے کہ ان لوگوں نے اشخاص کو حق کی جگہ دے رکھی ہے۔ جہاں وہ جاتے ہیں حق ان کے ہمرکاب ہوتا ہے اگرچہ وہ کعبہ کی جگہ کنشت ہی کی راہ اختیار کریں۔ عصبیت جاہلیت کی اس سے زیادہ گھنونی مثال اور کیا ہو سکتی ہے! حق پرستی کا تقاضا تو یہ تھا کہ اگر حق یہی ہے جو ہم کہہ رہے ہیں اور اس کے قبول کرنے میں محض ہماری کمزوریاں ان کے لیے رکاوٹ بنی ہوئی ہیں تو یہ خود اس کے داعی بنتے اور آگے چلتے۔ ہم انشاءاللہ ان کے پیچھے چلنے میں کوئی عار نہ محسوس کرتے لیکن یہ عجیب و غریب منطق ہماری سمجھ میں نہیں آتی کہ یہ دیدہ و دانستہ ایک غلط راہ پر چل سکتے ہیں بشرطیکہ اس کا داعی ان کے خیال کے مطابق دیندار ہو اور ایک صحیح راہ پر جس کی صحت کا ان کو خود اقرار ہے وہ نہیں چل سکتے کیونکہ اس کے داعی پر اصطلاحی دینداری کا لیبل نہیں چسپاں ہوا ہے۔ یہ حضرات کیتھولک چرچ کی طرح اپنے حلقہ سے باہر دینداری کا وجود شاید تسلیم نہیں کرتے ورنہ ظاہر ہے کہ اپنی اس منطق کی حمایت میں وہ کوئی دلیل نہیں پیش کر سکتے اور ہمیں یقین ہے کہ وہ اپنی اس پوزیشن پر خود بھی مطمئن نہیں ہیں اور جلد ان پر ان کی غلطی واضح ہو جائے گی۔ اگر آج نہیں تو کل کو وہ دیکھ لیں گے کہ حقیقت شخصی اور گروہی عصبیتوں سے کتنی بے نیاز ہے اور انسان حق کی جگہ اشخاص کو اپنا قبلہ و کعبہ بنا کر صرف اپنا نقصان کرتا ہے نہ کہ حق کا۔

سیاسی جماعتوں کی طرف سے مشکلات عوام کی بے پروائی اور علماء کی بے نیازانہ روش کے ساتھ ساتھ بعض سیاسی جماعتوں کا بھی آپ نے گلہ کیا ہے۔ ان جماعتوں کی مخالفت آپ کے ساتھ بالکل قدرتی ہے۔ ہمارے مقاصد اور ان کے مقاصد ایک دوسرے کے بالکل ضد واقع ہوئے ہیں۔ ہماری کامیابی اور ترقی میں درحقیقت ان کی موت مضمر ہے اس وجہ سے اگر وہ ہم کو اچھی طرح سمجھتی ہیں اور ساتھ ہی اپنے آپ کو بھی سمجھتی ہیں تو ان کو ہمارا دوست نہیں دشمن ہی ہونا چاہیے اور ہمیں ان کی طرف سے سب کچھ برداشت کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ وقت کی سیاسی جماعتوں میں سے کوئی جماعت ایسی نہیں ہے جس پر ہمارے لٹریچر اور ہماری دعوت کی زد براہ راست نہ پڑی ہو۔ آپ نے ان میں سے ہر ایک کے کام کو غلط کہا ہے اور ہر ایک کے وجود کو باطل قرار دیا ہے پھر آپ کیوں توقع رکھتے ہیں کہ وہ آپ کو پیار کریں گی۔ سیاسی جماعتیں زندگی کے کارزار میں جدوجہد کرتی ہیں۔ اپنے حریفوں کو توڑ دینا یا اپنا لینا ان کی فطرت ہے۔ ان سے کسی مرنجان مرنج پالیسی کی امید کرنا بالکل غلط ہے۔ لیکن اس بات کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ آپ ان کی مخالفانہ روش سے اندیشہ ناک ہوں۔ ہر مخالفت ڈرنے کی چیز نہیں ہوتی۔ مخالفت صرف وہ وزنی اور قابل لحاظ ہوتی ہے جو کسی اصول کے ساتھ کسی با اصول جماعت کی طرف سے ظاہر ہو۔ مجھے مسلمانوں میں کسی ایسی جماعت کا پتہ نہیں جس کا کوئی اصول ہو۔ ان کی حیثیت سیلاب میں بہنے والے تنکوں سے زیادہ نہیں ہے۔ باطل بھی اگر اس کی پشت پر سچی جماعت و جمعیت ہو اور اس کے قول و فعل میں مطابقت ہو تو ایک طاقت بن جاتا ہے لیکن یہ حق نما باطل تو ایک لمحہ بھی میدان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں نہیں ٹک سکتے جو ہماری سیاسی جماعتیں لے کر چلی ہیں۔ ان کی کمزوریاں خود ان پر واضح ہیں اور اگر ابھی حقیقت کے واضح ہونے میں کچھ کسر رہ گئی ہے تو میں پیشنگوئی کرتا ہوں کہ زمانہ جلد یہ کسر بھی پوری کر دے گا۔ اور وہ دن دور نہیں ہے جب یہ ساری جماعتیں اپنی ہستی باقی رکھنے کے لیے اس بات پر مجبور ہوں گی کہ ہماری سکھائی ہوئی بولیوں میں سے کسی نہ کسی بولی کو اختیار کریں۔ اور اپنے کھوٹے سکوں کو ہمارے کھرے سکوں کے ساتھ ملا کر چلانے کی کوشش کریں۔ آپ حضرات میں سے جو لوگ وقت کے حالات پر نظر رکھتے ہیں وہ میری اس پیشنگوئی کی تصدیق کریں گے کیونکہ ہمارے بہت سے الفاظ اب مختلف جماعتوں نے استعمال کرنے شروع کر دیے ہیں اور ان الفاظ کی مذہبی کشش سے وہ اپنی گرتی ہوئی پوزیشن سنبھالنا چاہتی ہیں۔ ہمارے بعض ارکان اس صورت حال کو تشویش کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اگر ہماری اصطلاحات ان جماعتوں نے اختیار کرلیں تو بہت جلد عوام کے ذہنوں میں ان اصطلاحات کا ایسا غلط مفہوم راسخ ہو جائے گا کہ اس کی اصلاح کے لیے ہم کو علٰحدہ جدوجہد کرنی پڑے گی نیز لوگوں میں یہ خیال پھیل جائے گا کہ ہم بھی وہی کچھ چاہتے ہیں جو یہ جماعتیں چاہتی ہیں لیکن مجھے اس بات سے کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ میں اس میں جماعت کے لیے کوئی خطرہ نہیں دیکھتا۔ البتہ یہ جماعتیں، اگر ان اصطلاحات کے استعمال میں نیک نیت نہیں ہیں بلکہ محض عوام فریبی کے لیے استعمال کر رہی ہیں تو مجھے خود ان کی موت اس میں نظر آتی ہے۔ اس وقت جب کہ ہمارا کام جاری ہے، ہمارا لٹریچر پوری تیزی کے ساتھ پھیل رہا ہے اور ہم خواص سے گزر کر عوام کے ذہنوں کے قریب بھی آنے کی کوشش کر رہے ہیں ہمیں اس کا ڈر نہیں ہے کہ لوگ ہماری اصطلاحات کی آڑ میں پناہ لے لیں گے۔ زیادہ زمانہ نہیں گزرے گا کہ ہماری باتیں کوچوں سے گونجیں گی اور گلیوں میں پکاری جائیں گی اور عامی سے عامی بھی ان کا وہی مفہوم سمجھے گا جو ہم سمجھانا چاہتے ہیں گے۔ اس وقت کسی کے لیے بھی یہ ممکن نہ ہو گا کہ ان پردوں میں چھپ سکے۔ یا تو لوگوں کو اس حقیقت کا صاف صاف اقرار کرنا پڑے گا جو ہم پیش کر رہے ہیں یا میدان سے ہٹنا پڑے گا۔ ابھی ہم یا تو اپنی پوری بات کہہ نہیں سکے ہیں یا لوگ سمجھ نہیں سکے ہیں اس وجہ سے دھوکا کھانے اور دھوکا دینے دونوں کا امکان ہے لیکن ان سارے امکانات کے سدباب کی تدبیریں ہم کر رہے ہیں۔ اور ہم کو یقین ہے کہ ان شاء اللہ ہم ہی فتحمند رہیں گے۔ سنۃ اللہ یہ ہے کہ جب تک حق میدان میں نہیں آتا باطل کو جینے کی مہلت ملتی ہے لیکن جب وہ میدان میں اتر آتا ہے تو اللہ تعالیٰ غلبہ اسی کو دیتا ہے۔ میں مسلمانوں کی موجودہ سیاسی اور مذہبی جماعتوں میں سے کسی میں یہ صلاحیت نہیں دیکھتا کہ وہ ہماری بنائی ہوئی گولیوں کو ہضم کر سکے۔ ان میں سے کسی جماعت کا نہ کوئی سیاسی فکر ہے نہ کوئی اصول کار۔ اور نہ ان میں سے کسی کے پاس وہ کیرکٹر ہے جو جماعتوں کو فتح دلاتا ہے۔ اہل باطل میں وہ قابلیتیں موجود رہی ہیں جن کا مظاہرہ نازیوں، اشتراکیوں اور جمہوریت کے علمبرداروں نے کیا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ حق کے ان مدعیوں میں، جو اسلام جیسے عظیم الشان حق کا نام لیتے ہیں، آج کوئی قوت و قابلیت موجود نہیں ہے۔ ان کی ہستی تمام تر دوسروں کے مستعار بلکہ مسروقہ الفاظ پر قائم ہے۔

خلافت راشدہ کے متعلق ایک عام غلط فہمی

حضرات! آپ میں سے بعضوں نے یہ سوال بھی اٹھایا ہے کہ جماعت اسلامی کے پیش نظر جو نصب العین ہے وہ بہترین ہاتھوں میں بھی ۳۰ سال سے زیادہ قائم نہ رہ سکا تو آج وہ لوگ کہاں سے آئیں گے جو اس نظام کو قائم کر سکیں گے اور ان کے ہاتھوں میں یہ زیادہ عرصہ تک قائم رہ سکے گا۔ اگرچہ آپ میں سے چند ہی حضرات نے یہ سوال

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

واقعہ یہ ہے لیکن یہ ایک عام شبہ ہے جو بہت سے دلوں میں موجود ہے اور اسی کی وجہ سے بہتوں کو یہ یقین ہے کہ اولاً تو پہلے اسلامی نظام کا قیام ناممکن ہے اور اگر ممکن ہے بھی تو یہ ایک سعی لاحاصل ہے کیونکہ جب بہترین انسانوں کے ہاتھوں اس پر [illegible] قلیل زمانہ تک قائم رہ سکا تو آج اس کے قیام و بقا کے متعلق کیا توقعات کی جا سکتی ہیں۔

ہمیں نہایت افسوس ہے کہ یہ باتیں آج وہ لوگ بھی کہتے ہیں جو کلمہ پڑھتے ہیں۔ شاید ان کو [illegible] اس بات کی خبر نہیں ہے کہ دنیا کا نظام درحقیقت اسلام کے خلاف ووٹ دینا ہے۔ اگر اسلامی نظام [illegible] نظری طور پر موجود ہے اور وہ بہترین انسانوں کے ہاتھوں میں بھی چند دنوں سے زیادہ قائم نہیں رہ سکتا تو نہ صرف اسلامی نظام کے تصور سے مستعفی ہو جانا چاہیے بلکہ نفس اسلام سے بھی مایوس ہو جانا چاہیے کیونکہ اسلام کی زندگی اس کے نظام سے باہر تصور نہیں کی جا سکتی۔ ایک اچھے مسلمان کے دل میں تو کبھی اس فاسد خیال کا گذر بھی نہیں ہونا چاہیے لیکن آج یہ شبہ عام طور پر لوگوں کے دلوں میں موجود ہے اور اسی کی وجہ سے اسلامی نظام کے قیام کی طرف سے لوگوں میں ایک عام افسردگی اور بے دلی پائی جاتی ہے [illegible] ضروری ہے کہ اس غلط فہمی کا ازالہ کیا جائے۔

حضرات! آپ کو معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم سے یہ مطالبہ نہیں کیا ہے کہ ہم [illegible] کی حکومت لازماً ایک حکومت قائم کر دیں۔ نہ بندوں کو اس بات کی طاقت ہی [illegible] البتہ یہ مطالبہ ضرور کیا ہے کہ ہم اقامت دین کے لیے جد و جہد کریں اور اس [illegible] اپنی زندگی بھی اور مال بھی اور اپنی تمام مرغوبات و محبوبات [illegible] اور دین سے مراد اجزائے دین میں سے کوئی جزو [illegible] خواہ وہ کتنا ہی اہم کیوں نہ ہو بلکہ دین بحیثیت مجموعی مراد ہے۔ اس کے کلیات بھی اور جزئیات بھی، عقائد بھی اور اعمال بھی [illegible] جد و جہد پورے عشق اور پوری تندہی کے ساتھ مطلوب ہے اور اللہ کے نزدیک یہی چیز ہمارے ایمان اور وفاداری کی کسوٹی ہے۔ لوگ جو اس ولولے سے خالی ہوں ایمان کے مستحق نہیں بن سکتے اور کوئی دل جو اس ولولے سے [illegible] خدا کا محبوب نہیں ہو سکتا۔ کتنی ہی تسبیحیں گردانی جائیں، کتنے ہی وظیفے پڑھے جائیں اور کتنی ہی عمریں نفلوں میں کھپائی جائیں، اس عشق کے بدل نہیں ہو سکتے۔ ساری دینداری کی روح یہی ہے اور خدا کے ہاں ہمارے دلوں کے اندر سب سے پہلے یہی چیز ڈھونڈی جاتی ہے اور یہ بھی ایک ضروری شرط ہے کہ یہ جد و جہد اجتماعی شکل میں ہو، انفرادی شکل میں نہیں۔ ہر فرد کا فرض ہے کہ وہ اپنے اندر اس کی گرمی پیدا کرے اور پھر یہ کوشش کرے کہ اس آگ سے سارے دل بھڑک اٹھیں۔ یہ سوال بحث سے خارج ہے کہ یہ جد و جہد کس نتیجہ تک ختم ہو گی۔ ہو سکتا ہے کہ ہم آروں سے چیر ڈالے جائیں، گلیوں میں گھسیٹے جائیں، [illegible] اور ہمارے جسموں کو [illegible] اور کوے نوچیں اور ان ساری باتوں کے بعد بھی ہمیں یہ سعادت حاصل نہ ہو سکے کہ ہم موجودہ نظام باطل کو ایک نظام حق سے بدل دیں لیکن نہ تو یہ ناکامی ناکامی ہے اور نہ اس کا اندیشہ بلکہ اس کا یقین بھی ہم کو اس مطالبہ سے سبکدوش [illegible] سکتا جو خدا نے اقامت دین کے لیے ہم سے کیا ہے۔ وہ تو ایک مستقل فرض ہے جو ہر قیمت پر اور ہر حال میں ادا کرنا ہے۔ اگر ہندوستان کی تمام [illegible] بھی آپ کو یہ سمجھانے کی کوشش کریں کہ فلاں فلاں [illegible] اور [illegible] تو [illegible] آپ کے [illegible]

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے دین کی عمارت کی ایک ایک اینٹ بھی اپنی جگہ سے ہٹی ہوئی ہے اور خدا کی زمین کا ایک ٹکڑا بھی غیر اللہ کی اطاعت کے نیچے دبا ہوا ہے اس وقت تک آپ کے لیے چین کی نیند حرام ہے۔

اس جدوجہد کے انجام کی نسبت ہم کچھ نہیں کہہ سکتے کہ کیا ہوگا۔ انجام کا حال صرف اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے۔ اگر اس جدوجہد کا نتیجہ یہ ہو کہ ہم ایک صالح نظام قائم کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو یہ اللہ تعالیٰ کا انعام ہوگا۔ بعض لوگ طنز سے یہ کہتے ہیں کہ ہماری ساری جدوجہد حکومت کے لیے ہے اور خدا کی رضا کی طلب جو خلاصہ دین ہے ہمارے سامنے نہیں ہے۔ یہ خیال بالکل غلط ہے۔ ہماری ساری جدوجہد اللہ کے دین کے قیام اور ایک صالح اور خدائی نظام کی اقامت کے لیے ہے اور یہ جدوجہد کوئی جرم نہیں ہے جس پر ہمیں شرمانے کی ضرورت ہو اور ہم جب کبھی حکومت الٰہیہ کا نام لیتے ہیں تو اس سے ہماری مراد یہی نظام ہوتا ہے اور میں نہیں سمجھتا کہ اس کے مطلوب و محبوب ہونے میں کس پہلو سے بحث کی جا سکتی ہے اور آخر یہ خدا کی رضا طلبی سے الگ چیز کیوں ہے؟ خدا کی رضا اس سے بڑھ کر کس بات میں ہو سکتی ہے کہ اس کی زمین پر اس کے احکام چلیں اور ان لوگوں سے بڑھ کر رضائے الٰہی کا طالب کون ہو سکتا ہے جو اس بات کے لیے سر دھڑ کی بازی لگائیں کہ خواہ کچھ بھی کیوں نہ ہو خدا کی زمین پر غیر اللہ کے اقتدار کا کوئی دھبہ نہ رہنے دیں گے۔ اگر یہ جدوجہد دنیاداری ہے تو کیا دینداری یہ ہے کہ راتوں میں بیٹھ کر اللہ ہو کی ضربیں لگائی جائیں اور دن میں خدا کی زمین پر شیطان کا تخت بچھانے کی کوشش کی جائے۔ جو لوگ اس طرح کی باتیں کہتے ہیں ان کے ذہنوں میں دین کا نہایت ناقص تصور ہے اور بہتر ہے کہ انہیں ابھی اس بات کے لیے مہلت دی جائے کہ وہ دین کی اصل حقیقت سمجھ سکیں۔

اگر صحیح اسلامی نظام صرف ۳۰ سال ہی قائم رہا جب بھی یہ ایسی چیز ہے جس کے لیے اگر ہم اپنی زندگیاں مٹا دیں تو یہ مہنگا سودا نہیں ہے بلکہ اس نظام خیر و برکت کی ایک شب بھی جس میں خدا کا بندہ صرف خدا کا محکوم رہتا ہے ان ہزارہا سال اور مہینوں سے افضل ہے جن میں خدا کے بندوں کو خدا کے سوا دوسروں کی غلامی کرنی پڑتی ہے۔ آپ ۳۰ سال کہتے ہیں میں تو اس کے ۳۰ منٹ بھی بہت سمجھتا ہوں اور اپنی اور اپنی جیسی لاکھوں زندگیوں کو اس کی قیمت نہیں سمجھتا۔ ذرا غور تو کیجیے، دنیا کی تمام سیاسی تنظیمات میں سب سے افضل جمہوریت کو سمجھا جاتا ہے لیکن اس کی نسبت قطعیت کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ محض ایک داستان ہے۔ نہ واقعہ کی صورت میں ایک لمحہ کے لیے بھی اس کا وجود ہوا، نہ کبھی اس کا تصور کیا جا سکتا ہے تاہم آپ دیکھتے ہیں کہ اس نظام کے لیے دنیا نے کتنی شاندار قربانیاں دی ہیں۔ پھر ایک ایسے نظام کے قیام کی طرف سے آپ کیوں بددل ہوتے ہیں جو عملاً دنیا میں خود آپ کے اقرار کے مطابق ۳۰ سال تک قائم رہ چکا ہے اور جس کے امن و عدل اور خیر و برکت پر مومن و منکر دونوں کی شہادت موجود ہے۔

لیکن یہ تاریخ کے نہایت ناقص مطالعہ کا نتیجہ ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ صحیح اسلامی نظام صرف ۳۰ سال ہی قائم رہا۔ بصیرت کی کمی کی وجہ سے اشخاص کی تبدیلی اور نظام کی تبدیلی میں لوگ فرق نہیں کرتے حالانکہ دونوں باتوں میں آسمان و زمین کا فرق ہے۔ خلافت راشدہ کے خاتمہ کے بعد جو تبدیلی واقع ہوئی وہ کانسٹی ٹیوشن کی تبدیلی نہیں تھی بلکہ اشخاص اور افراد کی تبدیلی تھی۔ ملک کا قانون وہی رہا، حکومت کا دستور وہی رہا، تعزیرات خدا کی قائم کی ہوئی تھیں، حدود اللہ کے مقرر کیے ہوئے تھے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جائدادیں قرآن کے بتائے ہوئے قانون کے مطابق تقسیم ہوتی تھیں۔ صرف اس نظام کے چلانے والے افراد میں یہ تبدیلی ضرور ہوگئی تھی کہ وہ صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ کی طرح متقی اور خدا ترس نہ تھے۔ تاہم ان میں سے کسی کے لیے بھی یہ ممکن نہ تھا کہ خدا کے قانون کی جگہ اپنا قانون چلادے۔ ان میں سے اگر کوئی شخص خدا کے کسی حکم کی ذمہ داریوں سے بچنا چاہتا تھا تو اس کو طرح طرح کے مذہبی حیلوں سے کام لینا پڑتا تھا۔ خدا سے علانیہ بغاوت ان میں سے بدسے بدتر آدمی بھی کرنے کی جرأت نہ کرتا تھا۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ بعد کے زمانوں میں ہم دیکھتے ہیں کہ جب مسند خلافت پر کوئی خدا ترس اور متقی انسان آگیا تو دفعۃً شب روز کے اندر دنیا میں وہ بہار آگئی جو فاروق اعظمؓ کے زمانہ میں آئی تھی اور ایسا معلوم ہونے لگا کہ گویا نظام حکومت میں سرے سے کوئی خرابی پیدا ہی نہیں ہوئی تھی۔ اور یہ واقعہ بھی ہے کہ دراصل نظام کے اندر کوئی بنیادی خرابی، جس کی اصلاح درطلب ہو، پیدا بھی نہیں ہوئی تھی۔ صرف اوپر کی خرابیاں پیدا ہوتی تھیں جو معمولی تبدیلی سے درست ہو جاتی تھیں۔ اس طرح کی اصلاحات کے دور اسلامی خلافت پر بار بار آئے اور جب تک اس کی بنیاد میں خرابی نہیں پیدا ہوئی یعنی خدا کی حکومت کی جگہ طاغوت کی حکومت نہیں قائم ہوگئی اس وقت تک دنیا میں خلافت راشدہ کی برکتوں کا دور بار بار آتا رہا اور اب بھی اس کے لیے جدوجہد کی جائے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کام میں ہماری مدد کیوں نہ فرمائے گا۔ اس آسمان کی چھت کے نیچے ہر طرح کے کام ہو رہے ہیں اور جن کاموں کے لیے وہ جدوجہد ظہور میں آجاتی ہے جو ان کے لیے مطلوب ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ کام بھی ہو جاتے ہیں۔ خواہ باطل ہوں یا حق۔ پھر جب اس کائنات کا رب اہل باطل کی جاں بازیوں کو بھی نامراد نہیں کرتا تو آخر ایک مقصد حق ہی سے اس کو اتنی عداوت کیوں ہوگی کہ اس کے لیے اگرچہ سر دھڑ کی بازی لگانے والے پیدا ہو جائیں لیکن وہ پورا نہ ہو سکے گا۔

کام کے ضروری شرائط لیکن ہر کام کا ایک مخصوص طریقہ ہوتا ہے، اور ضروری ہے کہ اس کو اسی طریقہ پر انجام دیا جائے۔ ایک کام کو اگر آپ غلط طریقہ پر کر رہے ہیں تو خواہ یہ غلطی آپ کتنی ہی نیک نیتی سے کریں اس غلطی کا نتیجہ اس عمل کی ناکامی کی شکل میں آپ کے سامنے آکے رہے گا۔ خدا کے بنائے ہوئے قوانین بالکل بے لوث اور بے لاگ ہوتے ہیں۔ نیک سے نیک انسان بھی اگر شہد کی جگہ حنظل استعمال کر رہا ہے تو اس کی نیکی کی وجہ سے حنظل میں شہد کی تاثیر نہیں پیدا ہو جائے گی۔ اسی طرح اگر مسلمان ایک کام کو غلط طریقہ پر کر رہے ہیں تو اس وجہ سے کہ وہ مسلمان ہیں اور اپنے زعم میں خدا کے ہاں بڑا درجہ رکھتے ہیں، یہ نہیں ہو سکتا کہ ان کا کام صحیح ہو جائے۔ اور اگر غیر مسلم کسی کام کو صحیح طریقہ پر انجام دینے کی جدوجہد میں سرگرم ہیں تو محض اس وجہ سے کہ وہ غیر مسلم ہیں یہ نہیں ہو سکتا کہ ان کی صحیح جدوجہد کا نتیجہ نہ نکلے۔ اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے قوانین میں اس طرح کی نا انصافی نہیں ہے۔ مسلمانوں میں یہ احساس بڑی شدت کے ساتھ پایا جاتا ہے کہ بحیثیت مسلمان کے اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکومت و اقتدار کی نعمت پانے کے مستحق وہی ہیں۔ اس احساس کے ساتھ جب وہ اپنی موجودہ حالت پر نظر ڈالتے ہیں تو ان کو قرآن کے وعدوں اور خدا کی طرف سے مایوسی ہونے لگتی ہے۔ وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ جب ہم مسلمان ہیں تو زمین کی وراثت ہمیں کو ملنی تھی۔ اگر نہیں ملی تو اس میں ان کا کوئی قصور نہیں ہے بلکہ وعدہ کرنے والے ہی کی طرف سے کوئی تغافل ہے۔ لیکن یہ خیال نہایت غلط ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کا وعدہ انفرادی کوششوں کے صلہ میں فرمایا ہے ان کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انفرادی کوششوں کے صلہ میں عطا فرماتا ہے لیکن جن چیزوں کا وعدہ جماعت سے ہے ان کے لیے ضروری ہے کہ جماعتی جدوجہد ظہور میں آئے، اگر ان کے لیے جماعتی جدوجہد ظہور میں نہ آئے تو خواہ انفرادی زہد و تقویٰ میں آپ کتنے ہی بڑھے ہوئے ہوں، آپ کے اندر جنید و شبلی اور سلمان و ابوذر کے درجہ کے اشخاص بھی کیوں نہ موجود ہوں لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ ان انفرادی نیکیوں کے صلہ میں آپ کو اللہ تعالیٰ کے وہ انعامات مل جائیں جو جماعتی نیکیوں کے لیے مخصوص ہیں۔ ہم کو اس امر سے انکار نہیں ہے کہ مسلمانوں میں آج بھی نہایت نیک اور صالح افراد موجود ہیں لیکن ان نیک اور صالح افراد نے مل کر کبھی اس بات کی کوشش نہیں کی کہ اس ملک میں ایک صالح نظام قائم کریں بلکہ اپنی انفرادی نیکیوں کے زعم میں ہمیشہ خدا سے شکوہ سنج رہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے اپنے وعدے پورے نہیں کیے۔ خدا نے جماعت سے ان کی جماعتی نیکیوں پر جو وعدے فرمائے ہیں وہ تو اس قدر اٹل ہیں کہ اگر وہ نیکیاں کسی جماعت کے اندر خدا کے انکار کے ساتھ بھی پیدا ہو جائیں جب بھی وہ صلے مل کر رہتے ہیں۔ پھر اگر کوئی جماعت ایمان و اسلام کی نعمت سے بہرہ ور ہو کر ایک صالح نظام کے لیے جدوجہد کرے تو کوئی وجہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے انعامات سے اس کو محروم فرمائے۔

جماعت اسلامی مسلمانوں کی اسی غلطی کی اصلاح کر رہی ہے۔ وہ قوم کے تمام صالح افراد کو منظم کر کے چاہتی ہے کہ ان کو ایک صالح نظام کے قیام کی جدوجہد میں لگائے اور اس کام کو انجام دینے کا جو صحیح طریقہ ہے اس طریقہ پر انجام دے۔ اگرچہ انجام بہرحال اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے لیکن ہمیں خدا کی ذات سے یہی امید ہے کہ ہماری جدوجہد کامیاب ہوگی اور ہم منزل مقصود تک پہنچ کے رہیں گے لیکن ایک طویل زمانہ تک جماعتی زندگی سے محروم رہنے کی وجہ سے ہم جماعتی زندگی کی خصوصیات اور ذمہ داریوں سے بالکل ناآشنا ہو گئے ہیں اس وجہ سے نہایت ضروری ہے کہ آج جب کہ ہم جماعتی زندگی کا ارادہ کر رہے ہیں اس کی ذمہ داریوں کو سمجھنے اور ادا کرنے کا اہتمام کریں۔

جماعتی زندگی کی خصوصیات

جماعتی زندگی کی سب سے بڑی امتیازی خصوصیت ڈسپلن اور جماعتی نظم کی پابندی ہے۔ جماعت وجود ہی میں اس نظم کی پابندی کے ارادہ سے آتی ہے اس وجہ سے اس سے ادنیٰ بے پروائی جماعت کی موت کے مرادف ہے۔ اس نظم کو قائم رکھنے کے لیے جماعت کے تمام افراد کو اپنی ذاتی خواہشوں اور انفرادی رایوں کی قربانی کرنی پڑتی ہے۔ اس زندگی میں کسر و انکسار شرط ضروری ہے۔ افراد بکھری ہوئی اینٹوں کے مانند ہیں ان کو ایک عمارت کی صورت اختیار کرنے کے لیے لازماً اس بات پر آمادہ ہونا پڑتا ہے کہ تھوڑا سا زخم گوارا کریں۔ اگر ہر اینٹ اس بات پر اصرار کرے کہ وہ کوئی زخم گوارا نہ کرے گی تو عمارت نہیں بن سکے گی۔ اسی طرح اگر آپ میں سے ہر فرد اپنی رائے پر اصرار کرے اور اپنی آزادی میں کسی قسم کی مداخلت نہ گوارا کرے تو جماعت نہیں بن سکتی اور اگر بن جائے گی تو قائم نہ رہ سکے گی۔ یہ نہیں خیال کرنا چاہیے کہ جماعتی زندگی آزادی رائے کو برباد کرنے والی چیز ہے۔ بے شک اس کے لیے آدمی کو اپنی آزادی کا ایک حصہ قربان کرنا پڑتا ہے لیکن اس تھوڑے حصہ کو قربان کر کے آدمی اپنی پوری آزادی کو محفوظ کر لیتا ہے۔ اور اگر کوئی شخص اس تھوڑی قربانی پر آمادہ نہیں ہوتا تو اسے اپنی پوری آزادی کھونی پڑتی ہے۔ جس طرح ایک خزانہ کا مالک اگر اپنے خزانہ کا کچھ حصہ پہرہ داروں اور پاسبانوں کی نذر نہ کرے تو اس کا پورا خزانہ خطرہ میں رہتا ہے اسی طرح افراد کی ساری آزادی خطرہ میں ہے اگر وہ جماعت کے حق میں اپنی آزادی رائے کو ایک حد تک قربان کرنے پر آمادہ نہ ہوں۔ آپ کی رپورٹوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابھی ہم میں اس شعور کی کمی ہے۔ کوشش کیجیے کہ لوگوں میں یہ شعور پیدا ہو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس کا پیدا ہونا محض ایک اخلاقی فضیلت نہیں ہے بلکہ ایک اہم دینی ضرورت ہے اور جن لوگوں کے اندر اس چیز کی کمی ہے وہ اس کی تلافی اس کو پورا کر کے ہی کر سکتے ہیں۔ نوافل کی کوئی مقدار اس کا بدل نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ اجتماعی نظم میں فساد پیدا کرنے والوں کے لیے اسلام میں نہایت سخت سزا ہے۔ جو لوگ اس چیز میں کوئی خرابی ڈالتے ہیں وہ اپنی ساری نیکیوں کا ثواب کھو بیٹھتے ہیں۔ پس میں ارکان جماعت کو نصیحت کرتا ہوں کہ وہ اس معاملہ میں ادنیٰ غفلت کو بھی راہ نہ دیں۔ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے پھر عرض کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے جو وعدے جماعت سے ہیں وہ افراد کے لیے نہیں ہیں [illegible] اور اسلام کوئی ایسا دین نہیں ہے جس کے مطالبات انفرادی زندگی سے پورے ہو سکیں خواہ ان میں کتنی ہی تقویٰ [illegible]

اسی کے ساتھ ساتھ ایک اور امر بھی قابل لحاظ ہے۔ وہ یہ ہے کہ دین کے بعض جزئیات کے متعلق [illegible] مختلف گروہوں میں خواہ مخواہ کی ایک مبالغہ آمیز عصبیت پیدا ہو گئی تھی۔ اور اس عصبیت کی شدت و خشونت [illegible] جزئیات کے لیے لوگ کٹنے مرنے تک لگ گئے تھے اور ان کا [illegible] اس قدر قوی ہو گیا تھا کہ ان کے آگے اصل دین کے سارے مطالبات دب گئے تھے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے بعض ارکان میں اب بھی یہ پرانا مذاق کچھ نہ کچھ باقی ہے جس کے سبب سے اندیشہ ہوتا ہے کہ مبادا اس سے نظم جماعت کو نقصان پہنچ جائے۔ ضرورت ہے کہ آپ اصل اور فرع میں امتیاز پیدا کریں [illegible] اور شاخوں کی آبیاری میں اس درجہ منہمک نہ ہو جائیں کہ درخت کی جڑ سوکھ کے رہ جائے۔ دین کا ایسا شعور [illegible] پیدا کرے اور ہر چیز کو اس کی اصلی جگہ دینے کا مذاق پیدا کرے نہایت ضروری ہے۔ اگر [illegible] آپ [illegible] فروع کو اصل بنا کر اس کی خاطر ساری جماعت اور سارے دین کو خطرہ میں ڈال دیں۔

اسی سلسلہ میں ایک اور بات پر بھی تنبیہ نہایت ضروری ہے وہ یہ کہ [illegible] لوگوں کے ذہنوں میں [illegible] ایک غلط تصور پیدا ہو گیا ہے کہ جب کسی دینی کام کا ارادہ کیا جائے لوگ اس کے کارکنوں میں ایسی باتیں ڈھونڈنے لگتے ہیں جن کی دین میں کوئی اصل نہیں ہے۔ اور جب وہ چیزیں نہیں پاتے تو پوری جماعت کو ایک غیر دینی جماعت بلکہ ایک [illegible] قرار دیتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ بہت سے لوگ یہ کہتے ہیں کہ جماعت اسلامی اپنے مقاصد کے اعتبار سے نہایت صالح اور اچھی جماعت ہے لیکن اس کے لیڈروں میں تقویٰ نہیں ہے۔ چونکہ اس پروپیگنڈے سے [illegible] ہمارے ارکان بھی متاثر ہونے [illegible] ہیں۔ اس وجہ سے ضروری ہے کہ بعض باتیں اس سلسلہ میں بھی گوش گزار کر دی جائیں۔ [illegible] مقصود اپنے آپ کو محفوظ کرنا نہیں بلکہ اصل حقیقت کا اظہار [illegible] ہے۔ [illegible] جماعت کے لیڈروں میں سے کسی کو بھی تقویٰ کا دعویٰ نہیں ہے البتہ ان حضرات کے تقویٰ پر حیرت ضرور ہے جو صحیح کام جماعت اسلامی کے کام کو سمجھتے ہیں لیکن ہمارے اندر تقویٰ کی کمی کی وجہ سے عام مسلمانوں کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ ان لوگوں کے پیچھے چلو جو اگرچہ غلط راہ پر جا رہے ہیں لیکن متقی ہیں۔ ہم ان کو خدا [illegible] کے سامنے [illegible] ان کی ذمہ داری یاد دلاتے ہیں کہ اگر [illegible] یہ راہ حق واضح ہے اور ان میں تقویٰ بھی موجود ہے تو وہ [illegible] آگے بڑھ کر زمام قیادت اپنے ہاتھوں میں لیں لیکن دیدہ و دانستہ مسلمانوں کو غلط راہ پر چلنے کا مشورہ نہ دیں۔ انھیں اس بات کو یاد رکھنا چاہیے کہ اس تقویٰ کے لیے ایک [illegible] یہ بھی ہے جس دن ان سے مسلمانوں کو دیدہ و دانستہ غلط مشورہ دینے کی بابت پرسش ہو گی اور وہ اس جواب سے بری نہ ہو سکیں گے کہ انھوں نے مسلمانوں کو متقی غلط کاروں کے پیچھے گمراہ ہونے کا مشورہ دیا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں اس موقع پر پورے اطمینان قلب کے ساتھ یہ حقیقت بھی واضح کرنے کی جرأت کرتا ہوں کہ اس زمانہ میں تقویٰ کے جو لوازم پیدا ہو گئے ہیں تقویٰ کے موسم بہار یعنی خیر القرون میں ان لوازم کا کوئی نام و نشان بھی نہ تھا۔ موجودہ تقویٰ میں صرف یہ کافی نہیں سمجھا جاتا کہ حرام کو حرام قرار دیا جائے اور آدمی اس سے پرہیز کرے بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ اللہ کی مباح کی ہوئی چیزوں کا بھی تارک ہو۔ اور ستم یہ کہ بعض مباحات کے ترک کا اس درجہ اہتمام ہے کہ جہاں آدمی میں ان چیزوں کا کوئی شائبہ پایا گیا وہ رند مشہور ہوا حالانکہ بڑے بڑے محرمات صریحہ میں یہ حضرات مبتلا ہیں لیکن ان کا احساس ان حضرات کو ذرا بے چین نہیں کرتا۔ اگر ایک آدمی قرینہ کی صاف ستھری زندگی بسر کرے تو ان کی ولایت سے وہ خارج ہے لیکن طاغوت کی حمایت و نصرت میں اپنی ساری قابلیتیں رات دن صرف کرنے والے محض چند رسمیات کی پابندی کی بدولت روزانہ قرب خداوندی کے نہایت بلند مراحل و مقامات طے کرتے ہیں اور ان کے سلوک میں کوئی شے مزاحم نہیں ہوتی۔ مسیح نے شاید اسی تقویٰ کو "مچھر کو چھاننے اور اونٹ کو نگلنے" سے تعبیر کیا ہے اور کتنی سچی تعبیر ہے یہ اس تقویٰ کی جس میں ڈاڑھی اور لباس کی ادنیٰ بے قاعدگی گوارا نہیں کی جاتی لیکن خدا کی ساری شریعت کی بربادی پر ان کے سینوں میں ایک آہ بھی نہیں۔

اس عہد میں تقویٰ کے لیے ایک شرط لازم یہ بھی ہے کہ آدمی کے پاس کسی خانقاہ کی سند ہو۔ بغیر اس سند کے چاہے کوئی شخص کتاب و سنت کا کتنا ہی پابند ہو مقام تقویٰ تک نہیں پہنچ سکتا۔ حالانکہ یہ شرط دین میں ایک اضافہ ہے۔ قرآن میں جس تقویٰ کی مدح کی گئی ہے وہ حدود الٰہی کی پاسداری اور خدا کے دین کو اپنے اوپر قائم کرنے اور دوسروں کو اس کی دعوت دینے سے زیادہ کچھ نہیں۔ اگر ایک شخص اللہ کے حدود سے ڈرتا ہے، خدا کی شریعت کی پابندی کا التزام کرتا ہے، محرمات اور بدعات سے بچتا ہے تو وہ متقی ہے خواہ وہ کسی خانقاہ سے وابستہ ہو یا نہ ہو۔ ظاہر داری، خاکساری، بے قرینہ تقشف، اقامت دین کی جدوجہد سے بے پروائی، عزلت اور اوراد و وظائف کا انہماک اور اس قبیل کی دوسری باتیں ہمارے یہاں نہیں ہیں اور جن حضرات کو ان چیزوں کی تلاش ہے بہتر ہے کہ وہ کسی خانقاہ کی راہ لیں۔ ہم سے ان چیزوں کا مطالبہ نہ کریں۔ ہم سے انہی چیزوں کا مطالبہ کیا جا سکتا ہے جن کی اصل اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت میں ہے۔ ان چیزوں کے سوا کوئی چیز ہم پر حجت نہیں قائم کر سکتی۔ میں ان باتوں کو اس لیے صاف صاف کہہ رہا ہوں کہ کسی کو ہماری نسبت کوئی غلط فہمی نہ رہے۔ ہم جتنے ہیں اس سے زیادہ ایک حرف ظاہر کرنا پسند نہیں کرتے۔

مجھے یہ حقیقت ظاہر کر دینے میں بھی کوئی باک نہیں ہے کہ آج یہ تقویٰ کے بہت سے لوازم جو پیدا کر لیے گئے ہیں وہ اقامت دین کی اصلی جدوجہد پر پردہ ڈالنے کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔ ان حضرات کو جب دین کے اصلی مطالبات مشکل معلوم ہوئے اور انھیں نظر آیا کہ اس راہ میں چند مقامات بہت سخت آتے ہیں اور ساتھ ہی ان کو یہ شرمندگی بھی گوارا نہ تھی کہ ان پر قصور ہمت کا الزام آئے تو انھوں نے دین کے اصلی مطالبات کے دوسرے بدل تجویز کر لیے۔ میدان کا کام انھوں نے دنیا کو فتنہ کہہ کر چھوڑ دیا اور خانقاہوں میں بیٹھ کر اوراد و وظائف کی مقداروں میں اضافہ کر دیا۔ پھر تقویٰ کی ایک خاص ہیئت قرار پا گئی اور متقیانہ زندگی کا ایک خاص نہج وجود میں آ گیا اور آہستہ آہستہ اب یہ حال ہو گیا ہے کہ ان کے ہاتھوں میں تقویٰ کا جو پیمانہ ہے ہمیں اندیشہ ہے کہ اگر اس سے خیر القرون کے مسلمانوں کو بھی ناپا جائے تو شاید وہ بھی متقی نہ ثابت ہو سکیں۔ ہم اس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تقویٰ کے قائل نہیں ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ کافی ہے کہ ایک سیدھے سادے اور پختہ مسلمان کی سی زندگی بسر کیجیے۔ خدا اور اس کے رسول کی جو باتیں آپ کے علم میں آئیں اس پر کاربند ہوں بلا تفتیش تنگ کر جم جائیے۔ اپنی زندگی کا برابر احتساب کرتے رہیے کہ آپ کے کام دکھاوے اور شہرت کے لیے نہ ہوں۔ اور رات دن اس جد وجہد میں لگے رہیے کہ خدا کے بندوں پر صرف خدا کا قانون حاکم ہو۔ دوسرے مدعیان حکومت یا تو مٹ جائیں یا ان کو بدلنے اور نہ بدلنے کی صورت میں ان کو مٹانے میں ہم مٹ جائیں۔ میں چاہتا ہوں کہ اب ان باتوں کو آپ گوش ہوش سے سن لیں۔ زمانہ بڑی تیزی سے بدل رہا ہے۔ ہمارے سامنے نہایت مشکل کام آنے والے ہیں نہ خبر کہ ہمارے سامنے کوئی سخت امتحان آ جائے اور ہماری فوج مغالطوں میں الجھی ہوئی ہو۔ آپ کے ہاتھ میں کتاب وسنت کے سوا کوئی پیمانہ نہیں ہونا چاہیے۔ اس پیمانہ سے اپنی جماعت کے افراد کو ناپتے رہیے۔ اپنے امیر کو بھی اور مامور کو بھی۔ اس احتساب میں جماعت کی زندگی ہے اور اس میں کسی قسم کی مداہنت اور مسامحت سے کام نہ لیجیے دوسرے خیالات جو بے اصل ہیں ان کو چھوڑ دیجیے اور اگر ان کی گرفت آپ پر اتنی سخت ہے کہ آپ ان سے الگ نہیں ہو سکتے تو ہمیں اس بات کا کوئی غم نہ ہوگا اگر آپ ہم کو چھوڑ دیں۔ ہم نہ تو خود دھوکے میں رہنا چاہتے ہیں نہ دوسروں کو دھوکا دینا چاہتے

اجلاس ہفتم

(تاریخ ایضاً)

نماز مغرب کے بعد آخری اجلاس منعقد ہوا۔ چونکہ اب اجتماع کے سلسلہ کا سارا پروگرام اختتام کو پہنچ چکا تھا اس لیے جماعت کو رخصت کرنے سے پہلے اس اجلاس میں امیر جماعت نے رفقاء وحاضرین سے آخری خطاب کیا جو درج ذیل ہے۔

امیر جماعت کی اختتامی تقریر

حمد وصلوٰۃ اور تمہیدی فقروں کے بعد فرمایا:۔

رفقاء وحاضرین۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے ہماری جد وجہد کا آخری مقصود انقلاب امامت ہے، یعنی دنیا میں ہم جس انتہائی منزل تک پہنچنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ فساق وفجار کی امامت وقیادت ختم ہو کر امامت صالحہ کا نظام قائم ہو اور اسی سعی وجہد کو ہم دنیا و آخرت میں رضائے الٰہی کے حصول کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ یہ چیز جسے ہم نے اپنا مقصد قرار دیا ہے، افسوس ہے کہ آج اس کی اہمیت سے مسلم اور غیر مسلم سبھی غافل ہیں۔ مسلمان اس کو محض ایک سیاسی مقصد سمجھتے ہیں اور ان کو کچھ احساس نہیں ہے کہ دین میں اس کی کیا اہمیت ہے۔ غیر مسلم کچھ تعصب کی بنا پر اور کچھ ناواقفیت کی وجہ سے اس حقیقت کو جانتے ہی نہیں کہ دراصل فساق وفجار کی قیادت ہی نوع انسانی کے مصائب کی جڑ ہے اور انسان کی بھلائی کا سارا انحصار صرف اس بات پر ہے کہ دنیا کے معاملات کی سربراہ کاری صالح لوگوں کے ہاتھوں میں ہو۔ آج دنیا میں جو فساد عظیم برپا ہے، جو ظلم اور طغیان ہو رہا ہے انسانی اخلاق میں جو عالمگیر بگاڑ رونما ہے، انسانی تمدن وتہذیب اور معیشت وسیاست کی رگ رگ میں جو زہر سرایت کر گئے۔ زمین کے تمام وسائل اور انسانی علوم کی دریافت کردہ ساری قوتیں جس طرح انسان کی فلاح وبہبود کے بجائے اس کی تباہی کیلئے استعمال ہو رہی ہیں۔ ان سب کی ذمہ داری اگر کسی چیز پر ہے تو وہ صرف یہی ہو کہ دنیا میں چاہے نیک لوگوں اور شریف انسانوں کی کمی نہ ہو مگر دنیا کے معاملات ان کے ہاتھ میں نہیں ہیں بلکہ خدا سے پھرے ہوئے اور مادہ پرستی و بداخلاقی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہیں ڈوبے ہوئے لوگوں کے ہاتھوں میں ہیں۔ اب اگر کوئی شخص دنیا کی اصلاح چاہتا ہو اور فساد کو صلاح سے، اضطراب کو امن سے، بداخلاقیوں کو اخلاق صالحہ سے اور برائیوں کو بھلائیوں سے بدلنے کا خواہشمند ہو تو اس کے لیے محض نیکیوں کا وعظ اور خداپرستی کی تلقین اور حسن اخلاق کی ترغیب ہی کافی نہیں ہے بلکہ اس کا فرض ہے کہ نوع انسانی میں جتنے صالح عناصر اس کو مل سکیں انہیں ملا کر وہ اجتماعی قوت بہم پہنچائے جس سے تمدن کی زمام کار فاسقوں سے چھینی جا سکے اور امامت کے نظام میں تغیر کیا جا سکے۔

انسانی زندگی کے مسائل میں جس کو تھوڑی سی بصیرت بھی حاصل ہوگی وہ اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہو سکتا کہ انسانی معاملات کے بناؤ اور بگاڑ کا آخری فیصلہ جس مسئلے پر منحصر ہے وہ یہ سوال ہے کہ معاملات انسانی کی زمام کار کس کے ہاتھ میں ہے۔ جس طرح گاڑی ہمیشہ اسی سمت چلا کرتی ہے جس سمت پر ڈرائیور اس کو لے جانا چاہتا ہو اور دوسرے لوگ جو گاڑی میں بیٹھے ہوں خواستہ و ناخواستہ اسی سمت پر سفر کرنے کے لیے مجبور ہوتے ہیں، اسی طرح انسانی تمدن کی گاڑی بھی اسی سمت پر سفر کیا کرتی ہے جس سمت پر وہ لوگ جانا چاہتے ہیں جن کے ہاتھ میں تمدن کی باگیں ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ زمین کے سارے ذرائع جن کے قابو میں ہوں، قوت و اقتدار جن کے ہاتھ میں ہو، عام انسانوں کی زندگی جن کے دامن سے وابستہ ہو، خیالات و افکار اور نظریات کو بنانے اور ڈھالنے کے وسائل جن کے قبضے میں ہوں، انفرادی سیرتوں کی تعمیر، اجتماعی نظام کی تشکیل اور اخلاقی قدروں کی تعیین جن کے اختیار میں ہو، ان کی رہنمائی و فرمانروائی کے تحت رہتے ہوئے انسانیت بحیثیت مجموعی اس راہ پر چلنے سے کسی طرح باز نہیں رہ سکتی جس پر وہ اسے چلانا چاہتے ہوں۔ یہ رہنما و فرمانروا اگر خداپرست اور صالح لوگ ہوں تو لامحالہ زندگی کا سارا نظام خداپرستی اور خیر و صلاح پر چلے گا، برے لوگ بھی اچھے بننے پر مجبور ہوں گے، بھلائیوں کو نشوونما نصیب ہوگا اور برائیاں اگر مٹیں گی نہیں تو کم از کم پروان بھی نہ چڑھ سکیں گی۔ لیکن اگر رہنمائی و قیادت اور فرمانروائی کا اقتدار ان لوگوں کے ہاتھ میں ہو جو خدا سے برگشتہ اور فسق و فجور میں سرگشتہ ہوں تو آپ سے آپ سارا نظام زندگی خدا سے بغاوت اور ظلم و بداخلاقی پر چلے گا۔ خیالات و نظریات، علوم و آداب، سیاست و معیشت، تہذیب و معاشرت، اخلاق و معاملات، عدل و قانون، سب کے سب بحیثیت مجموعی بگڑ جائیں گے۔ برائیاں خوب نشوونما پائیں گی اور بھلائیوں کو زمین اپنے اندر جگہ دینے سے اور ہوا اور پانی ان کو غذا دینے سے انکار کر دیں گے۔ اور خدا کی زمین ظلم و جور سے لبریز ہو کر رہے گی۔ ایسے نظام میں برائی کی راہ پر چلنا آسان اور بھلائی کی راہ پر چلنا کیا معنی قائم رہنا بھی مشکل ہوتا ہے۔ جس طرح آپ نے کسی بڑے مجمع میں دیکھا ہوگا کہ سارا مجمع جس طرف جا رہا ہو، اس طرف چلنے کے لیے تو آدمی کو کچھ قوت لگانے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ مجمع کی قوت سے خود بخود اسی طرف بڑھتا چلا جاتا ہے، لیکن اگر اس کے مخالف سمت میں اگر کوئی چلنا چاہے تو وہ بہت زور مار کر بھی بمشکل ایک آدھ قدم چل سکتا ہے اور جتنے قدم وہ چلتا ہے مجمع کا ایک ہی ریلا اس سے کئی گنے زیادہ قدم اسے پیچھے دھکیل دیتا ہے، اسی طرح اجتماعی نظام بھی جب غیر صالح لوگوں کی قیادت میں کفر و فسق کی راہ پر چل پڑتا ہے تو افراد اور گروہوں کے لیے غلط راہ پر چلنا تو اتنا آسان ہو جاتا ہے کہ انہیں بطور خود اس پر چلنے کے لیے کچھ زور لگانے کی بھی ضرورت نہیں پڑتی، لیکن اگر وہ اس کے خلاف چلنا چاہیں تو اپنے جسم و جان کا سارا زور لگانے پر بھی ایک آدھ قدم ہی راست پر بڑھ سکتے ہیں اور اجتماعی رو ان کی مزاحمت کے باوجود انہیں دھکیل کر میلوں پیچھے ہٹا لے جاتی ہے۔

یہ بات جو میں عرض کر رہا ہوں، یہ اب کوئی ایسی نظری حقیقت نہیں رہی ہے جسے ثابت کرنے کے لیے دلائل کی ضرورت ہو،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بلکہ واقعات نے اسے ایک بدیہی حقیقت بنا دیا ہے جس سے کوئی صاحب دیدۂ بینا انکار نہیں کرسکتا۔ آپ خود ہی دیکھ لیں کہ پچھلے سو برس کے اندر آپ کے اپنے ملک میں کس طرح خیالات و نظریات بدلے ہیں، مذاق اور مزاج بدلے ہیں، سوچنے کے انداز اور دیکھنے کے زاویے بدلے ہیں، تہذیب و اخلاق کے معیار اور قدر و قیمت کے پیمانے بدلے ہیں، زندگی کے طریقے اور معاملات کے ڈھنگ بدلے ہیں، اور کونسی چیز رہ گئی ہے جو بدل نہ گئی ہو۔ یہ سارا تغیر جو دیکھتے دیکھتے آپ کی اسی سرزمین میں ہوا اس کی اصلی وجہ آخر کیا ہے؟ کیا آپ اس کی وجہ اس کے سوا کچھ اور بتلا سکتے ہیں کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں زمام کار تھی، اور رہنمائی و فرمانروائی کی باگوں پر جن کا قبضہ تھا انھوں نے پورے ملک کے اخلاق، اذہان، نفسیات، معاملات اور نظام تمدن کو اس سانچے میں ڈھال کر رکھ دیا جو ان کی اپنی پسند کے مطابق تھا؟ پھر جن طاقتوں نے اس تغیر کی مزاحمت کی، ذرا حساب کر دیکھیے کہ انھیں کامیابی کتنی ہوئی اور ناکامی کتنی۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ کل جو مزاحمت کی تحریک کے پیشوا تھے آج ان کی اولاد وقت کی رو میں بہی چلی جا رہی ہے اور ان کے گھروں تک میں وہی سب کچھ پہنچ گیا ہے جو گھروں سے باہر پھیل چکا تھا؟ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ مقدس ترین مذہبی پیشواؤں تک کی نسل سے وہ لوگ اٹھ رہے ہیں جنھیں خدا کے وجود اور وحی و رسالت کے امکان میں بھی شک ہے؟ اس مشاہدے اور تجربے کے بعد بھی کیا کسی کو اس حقیقت کے تسلیم کرنے میں تامل ہوسکتا ہے کہ انسانی زندگی کے مسائل میں اصل فیصلہ کن مسئلہ زمام کار کا مسئلہ ہے؟ اور یہ اہمیت اس مسئلے نے کچھ آج ہی اختیار نہیں کی ہے بلکہ ہمیشہ سے اس کی یہی اہمیت رہی ہے۔ الناس علی دین ملوکھم بہت پرانا مقولہ ہے اور اسی بنا پر حدیث میں قوموں کے بناؤ اور بگاڑ کا ذمہ دار ان کے علماء اور امراء کو قرار دیا گیا ہے کیونکہ لیڈرشپ اور زمام کار انہی کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔

اس تشریح کے بعد یہ بات آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ دین میں اس مسئلہ کی کیا اہمیت ہے۔ ظاہر بات ہے کہ اللہ کا دین اول تو یہ چاہتا ہے کہ لوگ بالکلیہ بندۂ حق بن کر رہیں اور ان کی گردن میں اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی کا حلقہ نہ ہو پھر وہ یہ چاہتا ہے کہ اللہ ہی کا قانون لوگوں کی زندگی کا قانون بن کر رہے۔ پھر اس کا مطالبہ یہ ہے کہ زمین سے فساد مٹایا جائے، ان منکرات کا استیصال کیا جائے جو اہل زمین پر اللہ کے غضب کے موجب ہوتے ہیں، اور ان خیرات و حسنات کو فروغ دیا جائے جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہیں۔ ان تمام مقاصد میں کوئی مقصد بھی اس طرح پورا نہیں ہوسکتا کہ نوع انسانی کی رہنمائی و قیادت اور معاملات انسانی کی سربراہ کاری ائمۂ کفر و ضلال کے ہاتھوں میں ہو اور دین حق کے پیرو محض ان کے ماتحت رہ کر ان کی دی ہوئی رعایتوں اور گنجائشوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یاد خدا کرتے رہیں۔ یہ مقاصد تو لازمی طور پر اس بات کا مطالبہ کرتے ہیں کہ تمام اہل خیر و صلاح جو اللہ کی رضا کے طالب ہوں، اجتماعی قوت پیدا کریں اور سردھڑ کی بازی لگا کر ایک ایسا نظام حق قائم کرنے کی سعی کریں جس میں امامت و رہنمائی اور قیادت و فرمانروائی کا منصب مومنین صالحین کے ہاتھوں میں ہو۔ اس چیز کے بغیر وہ مدعا حاصل ہی نہیں ہوسکتا جو دین کا اصل مدعا ہے۔ اسی لیے دین میں امامت صالحہ کے قیام اور نظام حق کی اقامت کو مقصدی اہمیت حاصل ہے اور اس چیز سے غفلت برتنے کے بعد کوئی عمل ایسا نہیں ہوسکتا جس سے انسان اللہ تعالیٰ کی رضا کو پہنچ سکے۔ غور کیجیے کہ آخر قرآن و حدیث میں التزام جماعت اور سمع و طاعت پر اتنا زور کیوں دیا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص جماعت سے خروج اختیار کرے تو وہ واجب القتل ہے خواہ وہ کلمۂ توحید کا قائل اور نماز روزہ کا پابند ہی کیوں نہ ہو۔ کیا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس کی وجہ یہ اور صرف یہی نہیں ہے کہ امامت صالحہ اور نظام حق کا قیام و بقا دین کا حقیقی مقصود ہے، اور اس مقصد کا حصول اجتماعی طاقت پر موقوف ہے جو شخص اجتماعی طاقت کو نقصان پہنچاتا ہے وہ اتنے بڑے جرم کا ارتکاب کرتا ہے جس کی تلافی نہ نماز سے ہو سکتی ہے اور نہ اقرار توحید سے، پھر دیکھیے کہ آخر اس دین میں جہاد کو اتنی اہمیت کیوں دی گئی ہے کہ اس سے جی چرانے اور منہ موڑنے والوں پر قرآن مجید نفاق کا حکم لگاتا ہے؟ جہاد، نظام حق کی سعی کا ہی تو دوسرا نام ہے۔ اور قرآن اسی جہاد کو وہ کسوٹی قرار دیتا ہے جس پر آدمی کا ایمان پرکھا جاتا ہے۔ بالفاظ دیگر جس کے دل میں ایمان ہوگا وہ نہ تو نظام باطل کے تسلط پر راضی ہو سکتا ہے اور نہ نظام حق کے قیام کی جدوجہد میں جان و مال سے دریغ کر سکتا ہے، اور اگر کوئی اس معاملہ میں کمزوری دکھاتا ہے تو اس کا ایمان ہی مشتبہ ہے پھر بھلا کوئی دوسرا عمل اسے کیا نفع پہنچا سکتا ہے۔

اس وقت اتنا موقع نہیں ہے کہ میں آپ کے سامنے اس مسئلہ کی پوری تفصیل بیان کروں، مگر جو کچھ میں نے عرض کیا ہے وہ اس حقیقت کو ذہن نشین کرنے کے لیے بالکل کافی ہے کہ اسلام کے نقطۂ نظر سے امامت صالحہ کا قیام مرکزی اور مقصدی اہمیت رکھتا ہے، اور جو شخص اس دین پر ایمان لایا ہو اس کا کام صرف اتنے ہی پر ختم نہیں ہو جاتا کہ اپنی زندگی کو حتی الامکان اسلام کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرے، بلکہ عین اس کے ایمان ہی کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنی تمام سعی و جہد کو اس ایک مقصد پر مرکوز کر دے کہ زمام کار کفار و فساق کے ہاتھ سے نکل کر صالحین کے ہاتھ میں آئے اور وہ نظام حق قائم ہو جائے جو اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق دنیا کے انتظام کو درست رکھے۔ پھر چونکہ یہ مقصد اعلیٰ اجتماعی کوشش کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا اس لیے ایک ایسی جماعت صالحہ کا وجود ضروری ہے جو خود اصول حق کی پابند ہو اور نظام حق کو قائم کرنے، باقی رکھنے اور ٹھیک ٹھیک چلانے کے سوا دنیا میں کوئی دوسری غرض پیش نظر نہ رکھے۔ روئے زمین پر اگر صرف ایک ہی آدمی مومن ہو تب بھی اس کے لیے یہ درست نہیں ہے کہ اپنے آپ کو اکیلا پا کر اور ذرائع مفقود دیکھ کر نظام باطل کے تسلط پر راضی ہو جائے، یا "اھون البلیتین" کے شرعی حیلے تلاش کر کے غلبۂ کفر و فسق کے ماتحت کچھ آدھی پونی مذہبی زندگی کا سودا چکانا شروع کر دے، بلکہ اس کے لیے سیدھا اور صاف راستہ صرف یہی ایک ہے کہ بندگان خدا کو اس طریق زندگی کی طرف بلائے جو خدا کو پسند ہے۔ پھر اگر کوئی اس کی بات سن کر نہ دے تو اس کا ساری عمر صراط مستقیم پر کھڑے ہو کر لوگوں کو پکارتے رہنا اور پکارتے پکارتے مر جانا اس سے لاکھ درجہ بہتر ہے کہ وہ اپنی زبان سے وہ صدائیں بلند کرنے لگے جو ضلالت میں بھٹکی ہوئی دنیا کو مرغوب ہوں اور ان راہوں پر چل پڑے جن پر کفار کی امامت میں دنیا چل رہی ہو۔ اور اگر کچھ اللہ کے بندے اس کی بات سننے پر آمادہ ہو جائیں تو اس کے لیے لازم ہے کہ ان کے ساتھ مل کر ایک جتھا بنائے اور یہ جتھا اپنی تمام اجتماعی قوت اس مقصد عظیم کے لیے جدوجہد کرنے میں صرف کر دے جس کا میں ذکر کر رہا ہوں۔

حضرات! مجھے خدا نے دین کا جو تھوڑا بہت علم دیا ہے اور قرآن و حدیث کے مطالعہ سے جو کچھ بصیرت مجھے حاصل ہوئی ہے اس سے میں دین کا تقاضا یہی کچھ سمجھا ہوں۔ یہی میرے نزدیک کتاب الٰہی کا مطالبہ ہے، یہی انبیاء کی سنت ہے، اور میں اپنی اس رائے سے نہیں ہٹ سکتا جب تک کوئی خدا کی کتاب اور رسول کی سنت ہی سے مجھ پر یہ ثابت نہ کر دے کہ دین کا یہ تقاضا نہیں ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اپنی سعی کے اس مقصد و منتہا کو سمجھ لینے کے بعد اب ہمیں اس سنت اللہ کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے جس کے تحت ہم اپنے اس مقصود کو پا سکتے ہیں۔ یہ کائنات جس میں ہم رہتے ہیں، اس کو اللہ تعالیٰ نے ایک قانون پر بنایا ہے اور اس کی ہر چیز ایک لگے بندھے ضابطے پر چل رہی ہے۔ یہاں کوئی سعی محض پاکیزہ خواہشات اور اچھی نیتوں کی بنا پر کامیاب نہیں ہو سکتی اور نہ محض نفوس قدسیہ کی برکتیں ہی اس کو بارآور کر سکتی ہیں، بلکہ اس کے لیے ان شرائط کا پورا ہونا ضروری ہے جو کسی سعی کو بارآور کرنے کے لیے قانون الٰہی میں مقرر ہیں۔ آپ اگر زراعت کریں تو خواہ آپ کتنے ہی بزرگ صفت انسان ہوں اور تسبیح و تہلیل میں کتنا ہی مبالغہ کرتے ہوں، لیکن آپ کا پھینکا ہوا کوئی بیج بھی برگ و بار نہیں لا سکتا جب تک آپ اپنی سعی کاشتکاری میں اس قانون کی پوری پوری پابندی ملحوظ نہ رکھیں جو اللہ تعالیٰ نے کھیتوں کی بارآوری کے لیے مقرر کر دیا ہے۔ اسی طرح نظام امامت کا وہ انقلاب بھی جو اس وقت آپ کے پیش نظر ہے، کبھی محض دعاؤں اور پاک تمناؤں سے رونما نہ ہو سکے گا بلکہ اس کے لیے بھی ناگزیر ہے کہ آپ اس قانون کو سمجھیں اور اس کی ساری شرطیں پوری کریں جس کے تحت دنیا میں امامت قائم ہوتی ہے، کسی کو ملتی ہے اور کسی سے چھنتی ہے۔ اگرچہ اس سے پہلے بھی میں اس مضمون کو اپنی تحریروں اور تقریروں میں اشارۃً بیان کرتا رہا ہوں، لیکن آج میں اسے زیادہ تفصیل و تشریح کے ساتھ پیش کرنا چاہتا ہوں کیونکہ یہ وہ مضمون ہے جسے پوری طرح سمجھے بغیر ہمارے سامنے اپنی راہ عمل واضح نہیں ہو سکتی۔

انسان کی ہستی کا اگر تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اندر دو مختلف حیثیتیں پائی جاتی ہیں جو ایک دوسرے سے مختلف بھی ہیں اور باہم دگر ملی جلی بھی۔ اس کی ایک حیثیت تو یہ ہے کہ وہ اپنا ایک طبعی و حیوانی وجود رکھتا ہے جس پر وہی قوانین جاری ہوتے ہیں جو تمام طبعیات و حیوانات پر فرمانروائی کر رہے ہیں۔ اس وجود کی کارکردگی منحصر ہے ان آلات و وسائل پر، ان مادی ذرائع پر، اور ان طبعی حالات پر جن پر دوسری تمام طبعی اور حیوانی موجودات کی کارکردگی کا انحصار ہے۔ یہ وجود جو کچھ کر سکتا ہے قوانین طبعی کے تحت، آلات و وسائل کے ذریعہ سے اور طبعی حالات کے اندر ہی رہتے ہوئے کر سکتا ہے۔ اور اس کے کام پر عالم اسباب کی تمام قوتیں مخالف یا موافق اثر ڈالتی ہیں۔ دوسری حیثیت جو انسان کے اندر نمایاں نظر آتی ہے وہ اس کے انسان ہونے کی، یا بالفاظ دیگر ایک اخلاقی وجود ہونے کی حیثیت ہے۔

یہ اخلاقی وجود طبعیات کا تابع نہیں ہے بلکہ ان پر ایک طرح سے حکومت کرتا ہے۔ یہ خود انسان کے طبعی و حیوانی وجود کو بھی آلہ کے طور پر استعمال کرتا ہے اور خارجی دنیا کے اسباب کو بھی اپنا تابع بنانے اور ان سے کام لینے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کی کارکن قوتیں وہ اخلاقی اوصاف ہیں جو اللہ تعالیٰ نے انسان میں ودیعت فرمائے ہیں، اور اس پر فرمانروائی بھی طبعی قوانین کی نہیں بلکہ اخلاقی قوانین کی ہے۔

ل

یہ دونوں حیثیتیں انسان کے اندر ملی جلی کام کر رہی ہیں اور مجموعی طور پر اس کی کامیابی و ناکامی اور اس کے عروج و زوال کا مدار مادی اور اخلاقی دونوں قسم کی قوتوں پر ہے۔ وہ بے نیاز تو نہ مادی قوت سے ہو سکتا ہے اور نہ اخلاقی قوت سے۔ اسے عروج ہوتا ہے تو دونوں کے بل پر ہوتا ہے اور وہ گرتا ہے تو اسی وقت گرتا ہے جب یہ دونوں طاقتیں اس کے ہاتھ سے جاتی رہتی ہیں، یا ان میں وہ دوسروں کی بہ نسبت کمزور ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر غائر نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ انسانی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

زندگی میں اصل فیصلہ کن اہمیت اخلاقی طاقت کی ہے نہ کہ مادی کی۔ اس میں شک نہیں کہ مادی وسائل کا حصول، طبعی ذرائع کا استعمال اور اسباب خارجی کی موافقت بھی کامیابی کے لیے شرط لازم ہے اور جب تک انسان اس عالم طبعی (   ) میں رہتا ہے، یہ شرط کسی طرح ساقط نہیں ہو سکتی۔ مگر وہ اصل چیز جو انسان کو گراتی اور اٹھاتی ہی ہے، اس کی قسمت کے بنانے اور بگاڑنے میں سب سے بڑھ کر دخل حاصل ہے وہ اخلاقی طاقت ہی ہے۔ ظاہر ہے کہ ہم جس چیز کی وجہ سے انسان کو انسان کہتے ہیں وہ اس کی جسمانیت یا حیوانیت نہیں بلکہ اس کی اخلاقیت ہے۔ آدمی دوسری موجودات سے جس خصوصیت کی بنا پر ممیز ہوتا ہے وہ یہ نہیں ہے کہ وہ جگہ گھیرتا ہے یا سانس لیتا ہے یا نسل کشی کرتا ہے، بلکہ اس کی وجہ امتیازی خصوصیت جو اسے ایک مستقل نوع ہی نہیں، خلیفۃ اللہ فی الارض بناتی ہے وہ اس کا اخلاقی اختیار ہے اور اخلاقی ذمہ داری کا حامل ہونا ہے۔ پس جب اصل جوہر انسانیت اخلاق ہے تو لامحالہ یہ ماننا پڑے گا کہ اخلاقیات ہی کو انسانی زندگی کے بناؤ اور بگاڑ میں فیصلہ کن مقام حاصل ہے اور اخلاقی قوانین ہی انسان کے عروج و زوال پر فرمانروا ہیں۔

اس حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد جب ہم اخلاقیات کا تجزیہ کرتے ہیں تو وہ اصولی طور پر ہمیں دو بڑے شعبوں میں منقسم نظر آتے ہیں: ایک، بنیادی انسانی اخلاقیات۔ دوسرے، اسلامی اخلاقیات۔

بنیادی انسانی اخلاقیات سے مراد وہ اوصاف ہیں جن پر انسان کے اخلاقی وجود کی اساس قائم ہے اور ان میں وہ تمام صفات شامل ہیں جو دنیا میں انسان کی کامیابی کے لیے بہرحال شرط لازم ہیں خواہ وہ صحیح مقصد کے لیے کام کر رہا ہو یا غلط مقصد کے لیے۔ ان اخلاقیات میں اس سوال کا کوئی دخل نہیں ہے کہ آدمی خدا اور وحی اور رسول اور آخرت کو مانتا ہے یا نہیں، طہارتِ نفس اور نیتِ خیر اور عملِ صالح سے آراستہ ہے یا نہیں، اچھے مقصد کے لیے کام کر رہا ہے یا برے مقصد کے لیے۔ قطع نظر اس سے کہ کسی میں ایمان ہو یا نہ ہو اور اس کی زندگی پاک ہو یا ناپاک، اور اس کی سعی کا مقصد اچھا ہو یا برا، جو شخص اور جو گروہ بھی اپنے اندر وہ اوصاف رکھتا ہوگا جو دنیا میں کامیابی کے لیے ناگزیر ہیں وہ یقیناً کامیاب ہوگا اور ان لوگوں سے بازی لے جائے گا جو ان اوصاف کے لحاظ سے اس کے مقابلہ میں ناقص ہوں گے۔ مومن ہو یا کافر، نیک ہو یا بد، مصلح ہو یا مفسد، غرض جو بھی ہو، وہ اگر کارگر انسان ہو سکتا ہے تو صرف اسی صورت میں جبکہ اس کے اندر ارادے کی طاقت اور فیصلے کی قوت ہو، عزم اور حوصلہ ہو، صبر و ثبات اور استقلال ہو، تحمل اور برداشت ہو، ہمت اور شجاعت ہو، مستعدی و جفاکشی ہو، اپنے مقصد کا عشق اور اس کے لیے ہر چیز قربان کر دینے کا بل بوتا ہو، حزم و احتیاط اور معاملہ فہمی و تدبر ہو، باضابطگی کے ساتھ کام کرنے کا سلیقہ ہو، فرض شناسی اور احساسِ ذمہ داری ہو، حالات کو سمجھنے اور ان کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالنے اور مناسب تدبیر کرنے کی قابلیت ہو، اپنے جذبات و خواہشات اور ہیجانات پر قابو ہو، اور دوسرے انسانوں کو موہنے، ان کے دل میں جگہ پیدا کرنے اور ان سے کام لینے کی صلاحیت ہو۔ پھر ناگزیر ہے کہ اس کے اندر وہ شریفانہ خصائل بھی کچھ نہ کچھ موجود ہوں جو فی الحقیقت جوہرِ آدمیت ہیں اور جن کی بدولت آدمی کا وقار و اعتبار دنیا میں قائم ہوتا ہے۔ مثلاً خودداری، فیاضی، رحم، ہمدردی، انصاف، وسعتِ قلب و نظر، سچائی، امانت، راستبازی، پاسِ عہد، معقولیت، اعتدال، شائستگی، طہارت و نظافت، اور ذہن و نفس کا انضباط۔ یہ اوصاف اگر کسی قوم یا گروہ کے بیشتر افراد میں موجود ہوں تو گویا یوں سمجھیے کہ اس کے پاس وہ سرمایۂ انسانیت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

موجود ہے جس سے ایک طاقتور اجتماعیت وجود میں آسکتی ہے۔ لیکن یہ سرمایہ مجتمع ہو کر بالفعل ایک مضبوط و مستحکم اور کارگر اجتماعی طاقت نہیں بن سکتا جب تک کہ کچھ دوسرے اخلاقی اوصاف بھی اسکی مدد پر نہ آئیں، مثلاً تمام یا بیشتر افراد کسی اجتماعی نصب العین پر متفق ہوں اور اس نصب العین کو اپنی انفرادی اغراض بلکہ اپنی جان مال اور اولاد سے بھی عزیز تر رکھیں، ان کے اندر آپس کی محبت اور ہمدردی ہو، انھیں مل کر کام کرنا آتا ہو، وہ اپنی خودی و نفسانیت کو کم از کم اس حد تک قربان کر سکیں جو منظم سعی کے لیے ناگزیر ہے، وہ صحیح و غلط رہنما میں تمیز کر سکتے ہوں اور موزوں آدمیوں ہی کو اپنا رہنما بنائیں، ان کے رہنماؤں میں اخلاص اور حسن تدبیر اور رہنمائی کی دوسری ضروری صفات موجود ہوں، اور خود قوم یا جماعت اپنے رہنماؤں کی اطاعت کرنا جانتی ہو، ان پر اعتماد رکھتی ہو اور اپنے تمام ذہنی، جسمانی اور مادی ذرائع ان کے تصرف میں دے دینے پر تیار ہو۔ نیز پوری قوم کے اندر ایسی زندہ اور حساس رائے عام پائی جاتی ہو جو کسی ایسی چیز کو اپنے اندر پنپنے نہ دے جو اجتماعی فلاح کے لیے نقصان دہ ہو۔

یہ ہیں وہ اخلاقیات جن کو میں "بنیادی انسانی اخلاقیات" کے لفظ سے تعبیر کرتا ہوں، کیونکہ فی الواقع یہی اخلاقی اوصاف انسان کی اخلاقی طاقت کا اصل منبع ہیں، اور انسان کسی مقصد کے لیے بھی دنیا میں کامیاب سعی نہیں کر سکتا جب تک کہ ان اوصاف کا زور اس کے اندر موجود نہ ہو۔ ان اخلاقیات کی مثال ایسی ہے جیسے فولاد کہ وہ اپنی ذات میں مضبوطی و استحکام رکھتا ہے، اور اگر کوئی کارگر ہتھیار بن سکتا ہے تو اسی سے بن سکتا ہے۔ قطع نظر اس سے کہ وہ غلط مقصد کے لیے استعمال ہو یا صحیح مقصد کے لیے۔ آپ کے پیش نظر صحیح مقصد ہو تب بھی تو آپ کے لیے مفید وہی ہتھیار ہو سکتا ہے جو فولاد سے بنا ہو، نہ کہ سڑی ہوئی پھس پھسی لکڑی سے جو ایک ذرا سے بوجھ اور معمولی سی چوٹ کی تاب بھی نہ لا سکتی ہو۔ یہی وہ بات ہے جسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں بیان فرمایا ہے کہ خیارکم فی الجاھلیۃ خیارکم فی الاسلام، "تم میں جو لوگ جاہلیت میں اچھے تھے وہی اسلام میں بھی اچھے ہیں" یعنی زمانۂ جاہلیت میں جو لوگ اپنے اندر جوہر قابل رکھتے تھے وہی زمانۂ اسلام میں مردان کار ثابت ہوئے، فرق صرف یہ ہے کہ ان کی قابلیتیں پہلے غلط راہوں میں صرف ہو رہی تھیں اور اسلام نے آکر انھیں صحیح راہ پر لگا دیا۔ مگر بہرحال ناکارہ انسان نہ جاہلیت کے کسی کام کے تھے نہ اسلام کے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو عرب میں جو زبردست کامیابی حاصل ہوئی اور جس کے اثرات تھوڑی ہی مدت گذرنے کے بعد دریائے سندھ سے لے کر اٹلانٹک کے ساحل تک دنیا کے ایک بڑے حصے نے محسوس کر لیے، اس کی وجہ یہی تو تھی کہ آپ کو عرب میں بہترین انسانی مواد مل گیا تھا جس کے اندر کیرکٹر کی زبردست طاقت موجود تھی۔ اگر خدانخواستہ آپ کو بودے، کم ہمت، ضعیف الارادہ اور ناقابل اعتماد لوگوں کی بھیڑ مل جاتی تو کیا پھر بھی وہ نتائج نکل سکتے تھے؟

اب اخلاقیات کے دوسرے شعبے کو لیجیے جسے میں "اسلامی اخلاقیات" کے لفظ سے تعبیر کر رہا ہوں۔ یہ بنیادی انسانی اخلاقیات سے الگ کوئی چیز نہیں ہے بلکہ اسی کی تصحیح اور تکمیل ہے۔

اسلام کا پہلا کام یہ ہے کہ وہ بنیادی انسانی اخلاقیات کو ایک صحیح مرکز و محور مہیا کر دیتا ہے جس سے وابستہ ہو کر وہ سراسر خیر بن جاتے ہیں۔ اپنی ابتدائی صورت میں یہ اخلاقیات مجرد ایک قوت ہیں، جو خیر بھی ہو سکتی ہے اور شر بھی۔ جس طرح تلوار کا حال ہے کہ وہ بس ایک کاٹ ہے جو ڈاکو کے ہاتھ میں جا کر آلۂ ظلم بھی بن سکتی ہے اور مجاہد فی سبیل اللہ کے ہاتھ میں جا کر وسیلۂ خیر بھی۔ اسی طرح ان اخلاقیات کی طاقت بھی کسی شخص یا گروہ میں ہونا بجائے خود خیر نہیں ہے بلکہ اس کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خیر ہونا موقوف ہے اس امر پر کہ یہ قوت صحیح راہ میں صرف ہو۔ یہ اس کو صحیح راہ پر لگانے کی خدمت اسلام انجام دیتا ہے۔ اسلام کی دعوتِ توحید کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ دنیا کی زندگی میں انسان کی تمام کوششوں اور محنتوں اور دوڑ دھوپ کا مقصد وحید اللہ تعالیٰ کی رضا کا حصول ہو۔ والیک نسعی ونحفد۔ اور اس کا پورا دائرۂ فکر و عمل ان حدود سے محدود ہو جائے جو اللہ نے اس کے لیے مقرر کر دی ہیں۔ ایاک نعبد ولک نصلی ونسجد۔ اس اساسی اصلاح کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ تمام بنیادی اخلاقیات جن کا ابھی میں نے آپ سے ذکر کیا ہے، صحیح راہ پر لگ جاتے ہیں اور وہ قوت جو ان اخلاقیات کی موجودگی سے پیدا ہوتی ہے بجائے اس کے کہ نفس یا خاندان یا قوم یا ملک کی سربلندی پر ہر ممکن طریقے سے صرف ہو، خالص حق کی سربلندی پر صرف جائز طریقوں سے صرف ہونے لگتی ہے۔ یہی چیز اس کو ایک مجرد قوت کے مرتبے سے اٹھا کر ایک بھلائی اور دنیا کے لیے ایک رحمت بنا دیتی ہے۔

دوسرا کام جو اخلاق کے باب میں اسلام کرتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ بنیادی انسانی اخلاقیات کو مستحکم بھی کرتا ہے اور پھر ان کے اطلاق کو انتہائی حدود تک وسیع بھی کر دیتا ہے۔ مثال کے طور پر صبر کو لیجیے۔ بڑے سے بڑے صابر آدمی میں بھی جو محض دنیوی اغراض کے لیے ہو اور جسے شرک یا مادہ پرستی کی فکری جڑوں سے غذا مل رہی ہو، اس کے برداشت اور اس کے ثبات و قرار کی ایک حد ہوتی ہے جس کے بعد وہ گھبرا اٹھتا ہے۔ لیکن جس صبر کو توحید کی جڑ سے غذا ملے اور جو دنیا کے لیے نہیں بلکہ اللہ رب العالمین کے لیے ہو، وہ تحمل و برداشت اور پامردی کا ایک اتھاہ خزانہ ہوتا ہے جسے دنیا کی تمام ممکن مشکلات مل کر بھی لوٹ نہیں سکتیں۔ پھر غیر مسلم کا صبر نہایت محدود نوعیت کا ہوتا ہے۔ اس کا حال یہ ہوتا ہے کہ ابھی توپوں اور گولیوں کی بوچھاڑ میں نہایت استقلال کے ساتھ ڈٹا ہوا تھا، اور ابھی جو جذبات شہوانی کی تسکین کا کوئی موقع سامنے آیا تو وہ نفس امارہ کی ایک معمولی تحریک کے مقابلے میں بھی نہ ٹھہر سکا۔ لیکن اسلام صبر کو انسان کی پوری زندگی میں پھیلا دیتا ہے اور اسے صرف خطرات، مصائب اور مشکلات ہی کے مقابلے میں نہیں بلکہ تمام ایسے لالچوں، خطروں، اندیشوں اور خواہشوں کے مقابلے میں بھی ٹھہراؤ کی ایک ایسی زبردست طاقت بنا دیتا ہے جو آدمی کو راہ راست سے ہٹانے والے ہوں۔ درحقیقت اسلام مومن کی پوری زندگی کو ایک صابرانہ زندگی بناتا ہے جس کا بنیادی اصول ہی یہ ہے کہ عمر بھر صحیح طرزِ خیال اور صحیح طرزِ عمل پر قائم رہو خواہ اس میں کتنے ہی خطرات و نقصانات اور مشکلات ہوں اور اس دنیا کی زندگی میں اس کا کوئی مفید نتیجہ نکلتا نظر نہ آتا ہو، اور کبھی فکر و عمل کی برائی نہ اختیار کرو خواہ فائدوں اور امیدوں کا کیسا ہی خوشنما سبز باغ تمہارے سامنے لہلہا رہا ہو۔ یہ آخرت کے قطعی نتائج کی توقع پر دنیا کی ساری زندگی میں بدی سے رکنا اور خیر کی راہ پر جم کر چلنا اسلامی صبر ہے اور اس کا ظہور ان انتہائی شکلوں میں بھی ہوتا ہے جو بہت محدود پیمانے پر کفار کی زندگی میں نظر آتی ہیں۔ اسی خیال پر دوسرے تمام بنیادی اخلاقیات کو بھی آپ قیاس کر سکتے ہیں جو کفار کی زندگی میں صحیح فکری بنیاد نہ ہونے کی وجہ سے ضعیف اور محدود ہوتے ہیں اور اسلام ان سب کو ایک صحیح بنیاد دے کر محکم بھی کرتا ہے اور وسیع بھی کر دیتا ہے۔

اسلام کا تیسرا کام یہ ہے کہ وہ بنیادی اخلاقیات کی ابتدائی منزل پر اخلاق فاضلہ کی ایک نہایت شاندار بالا منزل تعمیر کرتا ہے جس کی بدولت انسان اپنے شرف کی انتہائی بلندیوں پر پہنچ جاتا ہے۔ وہ اس کے نفس کو خود غرضی سے نفسانیت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے، ظلم سے، بے حیائی اور خلاعت و بے قیدی سے پاک کر دیتا ہے، اس میں خدا ترسی، تقویٰ و پرہیزگاری، اور حق پرستی پیدا کرتا ہے، اس کے اندر اخلاقی ذمہ داریوں کا شعور و احساس ابھارتا ہے، اس کو ضبط نفس کا خوگر بناتا ہے، اسے تمام مخلوقات کے لیے کریم، فیاض، رحیم، ہمدرد، امین، بے غرض خیر خواہ، بے لوث منصف، اور ہر حال میں صادق و راستباز بنا دیتا ہے، اور اس میں ایک ایسی بلند پایہ سیرت پرورش کرتا ہے جس سے ہمیشہ صرف بھلائی ہی متوقع ہو اور برائی کا کوئی اندیشہ نہ ہو۔ پھر اسلام آدمی کو محض نیک ہی بنانے پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ حدیث رسول کے الفاظ میں وہ اسے مفتاح للخیر مغلاق للشر، یعنی بھلائی کا دروازہ کھولنے والا اور برائی کا دروازہ بند کرنے والا بناتا ہے۔ یعنی وہ اپنا یہ مشن اس کے سپرد کرتا ہے کہ دنیا میں بھلائی پھیلائے اور برائی کو روکے۔ اس سیرت و اخلاق میں فطرۃً وہ حسن ہے۔ وہ کشش ہے۔ وہ بلا کی قوت تسخیر ہے کہ اگر کوئی منظم جماعت اس سیرت کی حامل ہو اور عملاً اپنے اس مشن کے لیے سعی کرے، جو اسلام نے اس کے سپرد کیا ہے، تو اس کی جہانگیری کا مقابلہ کرنا دنیا کی کسی قوت کے بس کا کام نہیں ہے۔

اب میں چند الفاظ میں اس سنت اللہ کو بیان کیے دیتا ہوں جو امامت کے باب میں ابتدائے آفرینش سے جاری ہے اور جب تک نوع انسانی اپنی موجودہ فطرت پر زندہ ہے اس وقت تک برابر جاری رہے گی۔ اور وہ یہ ہے کہ:

(۱) اگر دنیا میں کوئی منظم انسانی گروہ ایسا موجود نہ ہو جو اسلامی اخلاقیات اور بنیادی انسانی اخلاقیات دونوں سے آراستہ ہو اور پھر مادی اسباب و وسائل بھی استعمال کرے تو دنیا کی امامت و قیادت لازماً کسی ایسے گروہ کے قبضے میں دی جاتی ہے جو بنیادی انسانی اخلاقیات اور مادی اسباب و وسائل کے اعتبار سے دوسروں کی بہ نسبت زیادہ بڑھا ہوا ہو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ بہرحال اپنی دنیا کا انتظام چاہتا ہے اور یہ انتظام اسی گروہ کے سپرد کیا جاتا ہے جو موجود الوقت گروہوں میں اہل تر ہو۔

(۲) لیکن اگر کوئی منظم گروہ ایسا موجود ہو جو اسلامی و انسانی اخلاقیات اور بنیادی اخلاقیات دونوں میں باقی ماندہ انسانی دنیا پر فضیلت رکھتا ہو، اور وہ مادی اسباب و وسائل کے استعمال میں بھی کوتاہی نہ کرے، تو یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ اس کے مقابلہ میں کوئی دوسرا گروہ دنیا کی امامت و قیادت پر قابض رہ سکے۔ ایسا ہونا فطرت کے خلاف ہے، اللہ کی اس سنت کے خلاف ہے جو انسانوں کے معاملہ میں اس نے مقرر کر رکھی ہے، ان وعدوں کے خلاف ہے جو اللہ نے اپنی کتاب میں مومنین صالحین سے کیے ہیں، اور اللہ ہرگز فساد پسند نہیں ہے کہ اس کی دنیا میں ایک صالح گروہ انتظام عالم کو ٹھیک ٹھیک اس کی رضا کے مطابق درست رکھنے والا موجود ہو اور پھر بھی وہ مفسدوں ہی کے ہاتھ میں اس نظام کی باگ ڈور رہنے دے۔ مگر یہ خیال رہے کہ اس نتیجے کا ظہور صرف اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ ایک جماعت صالحہ ان اوصاف کی موجود ہو۔ کسی ایک صالح فرد، یا متفرق طور پر بہت سے صالح افراد موجود ہونے سے استخلاف فی الارض کا نظام تبدیل نہیں ہو سکتا، خواہ وہ افراد اپنی جگہ کیسے ہی زبردست اولیاء اللہ بلکہ پیغمبر ہی کیوں نہ ہو۔ اللہ نے استخلاف کے متعلق جتنے وعدے بھی کیے ہیں، منتشر و متفرق افراد سے نہیں بلکہ ایک ایسی جماعت سے کیے ہیں جو دنیا میں اپنے آپ کو عملاً خیر اُمۃ اور اُمۃ وسطاً ثابت کر دے۔ نیز یہ بھی ذہن نشین رہے کہ ایسے ایک گروہ کے محض وجود میں آجانے ہی سے نظام امامت میں تغیر واقع نہ ہو جائے گا کہ ادھر وہ بنے اور ادھر اچانک آسمان سے کچھ فرشتے اتریں اور فساق و فجار

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کو اقتدار کی گدی سے ہٹا کر انھیں مسند نشین کر دیں، بلکہ اس جماعت کو کفر و فسق کی طاقتوں سے زندگی کے ہر میدان میں ہر ہر قدم پر کشمکش اور مجاہدہ کرنا ہوگا اور اقامت حق کی راہ میں ہر قسم کی قربانیاں دے کر اپنی محبت حق اور اپنی اہلیت کا ثبوت دینا پڑے گا۔ یہ ایسی شرط ہے جس سے انبیاء تک مستثنیٰ نہ رکھے گئے کجا کہ آج کوئی اس سے مستثنیٰ ہونے کی توقع کرے۔

(۳) مادی طاقت اور اخلاقی طاقت کے تناسب کے باب میں قرآن اور تاریخ کے غائر مطالعہ سے جو سنت اللہ میں سمجھا ہوں وہ یہ ہے کہ جہاں اخلاقی طاقت کا سارا انحصار صرف بنیادی انسانی اخلاقیات پر ہو وہاں مادی وسائل بڑی اہمیت رکھتے ہیں، حتیٰ کہ اس امر کا بھی امکان ہے کہ اگر ایک گروہ کے پاس مادی وسائل کی طاقت بہت زیادہ ہو تو وہ تھوڑی اخلاقی طاقت سے بھی دنیا پر چھا جاتا ہے اور دوسرے گروہ اخلاقی طاقت میں فائق تر ہونے کے باوجود محض وسائل کی کمی کے باعث دبے رہتے ہیں لیکن جہاں اخلاقی طاقت میں اسلامی اور بنیادی، دونوں قسم کے اخلاقیات کا پورا زور شامل ہو وہاں مادی وسائل کے انتہائی کمی کے باوجود اخلاق کو آخر کار ان تمام طاقتوں پر غلبہ حاصل ہو کر رہتا ہے جو مجرد بنیادی اخلاقیات اور مادی سر و سامان کے بل بوتے پر اٹھی ہوں۔ اس نسبت کو یوں سمجھیے کہ بنیادی اخلاقیات کے ساتھ اگر سو درجے مادی طاقت کی ضرورت ہوتی ہے تو اسلامی اور بنیادی اخلاقیات کی مجموعی قوت کے ساتھ صرف ۲۵ درجے مادی طاقت کافی ہو جاتی ہے۔ باقی ۷۵ فی صدی قوت کی کمی کو محض اسلامی اخلاق کا زور پورا کر دیتا ہے۔ بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد کا تجربہ تو یہ بتاتا ہے کہ اسلامی اخلاق اگر اس پیمانے کا ہو جو حضور اور آپ کے صحابہ کا تھا تو صرف پانچ فیصدی مادی طاقت سے بھی کام چل جاتا ہے۔ یہی حقیقت ہے جس کی طرف آیت اِنْ یَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ یَغْلِبُوْا مِائَتَیْنِ میں ارشاد کیا گیا ہے۔

یہ آخری بات جو میں نے عرض کی ہے اسے محض خوش عقیدگی پر محمول نہ کیجیے اور نہ یہ گمان کیجیے کہ میں کسی معجزہ و کرامت کا آپ سے ذکر کر رہا ہوں۔ نہیں، یہ بالکل ایک فطری حقیقت ہے۔ جو اس عالم اسباب میں قانون علت و معلول کے تحت پیش آتی ہے اور ہر وقت رونما ہو سکتی ہے اگر اس کی علت موجود ہو۔ میں مناسب سمجھتا ہوں کہ آگے بڑھنے سے پہلے چند الفاظ میں اس کی تشریح کر دوں کہ اسلامی اخلاقیات سے (جن میں بنیادی اخلاقیات خود بخود شامل ہیں) مادی اسباب کی ۷۵ فی صدی بلکہ ۹۵ فی صدی تک کمی کس طرح پوری ہو جاتی ہے۔ اس چیز کو سمجھنے کے لیے آپ ذرا خود اپنے زمانہ ہی کی بین الاقوامی صورت حال پر ایک نگاہ ڈال کر دیکھیے۔ ابھی آپ کے سامنے وہ فساد عظیم جو آج سے ساڑھے پانچ سال پہلے ہوا تھا جرمنی کی شکست پر ختم ہوا ہے اور جاپان کی شکست بھی قریب نظر آ رہی ہے جہاں تک بنیادی اخلاقیات کا تعلق ہے، ان کے اعتبار سے اس فساد کے دونوں فریق تقریباً مساوی ہیں، بلکہ بعض پہلوؤں سے جرمنی اور جاپان نے اپنے حریفوں کے مقابلہ میں زیادہ زبردست اخلاقی طاقت کا ثبوت دیا ہے۔ جہاں تک علوم طبیعی اور ان کے عملی استعمال کا تعلق ہے اس میں بھی دونوں فریق برابر ہیں، بلکہ اس معاملہ میں کم از کم جرمنی کی فوقیت تو کسی سے مخفی نہیں ہے۔ مگر صرف ایک چیز ہے جس میں ایک فریق دوسرے فریق سے بہت زیادہ بڑھا ہوا ہے، اور وہ ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مادی اسباب کی موافقت۔ اس کے پاس آدمی اپنے دونوں حریفوں سے کئی گنے زیادہ ہیں اس کو مادی وسائل ان کی بہ نسبت بدرجہا زیادہ حاصل ہیں۔ اُس کی جغرافی پوزیشن ان سے بہتر ہے اور اس کو تاریخی اسباب نے ان کے مقابلہ میں بہت زیادہ بہتر حالات فراہم کر دیے ہیں۔ اسی وجہ سے اس کو فتح نصیب ہوئی ہے، اور اسی وجہ سے آج کسی ایسی قوم کے لیے بھی جس کی تعداد کم ہو اور جس کی دسترس میں مادی وسائل کم ہوں، اس امر کا امکان نظر نہیں آتا کہ وہ کثیر التعداد اور کثیر الوسائل قوموں کے مقابلہ میں سر اٹھا سکے، خواہ وہ بنیادی اخلاقیات میں اور طبعی علوم کے استعمال میں ان سے کچھ بڑھ ہی کیوں نہ جائے۔ اس لیے کہ بنیادی اخلاق اور طبعی علوم کے بل پر اٹھنے والی قوم کا معاملہ دو حال سے خالی نہیں ہو سکتا۔ یا تو وہ خود اپنی قومیت کی پرستار ہوگی اور دنیا کو اپنے لیے مسخر کرنا چاہے گی یا پھر وہ کچھ عالمگیر اصولوں کی حامی بن کر اٹھے گی اور دوسری قوموں کو ان کی طرف دعوت دے گی۔ پہلی صورت میں تو اس کے لیے کامیابی کی کوئی شکل بجز اس کے ہے ہی نہیں کہ وہ مادی طاقت اور وسائل میں دوسروں سے فائق تر ہو، کیونکہ وہ تمام قومیں جن پر اس کی اس حرص اقتدار کی زد پڑ رہی ہوگی، انتہائی غصہ و نفرت کے ساتھ اس کی مزاحمت کریں گی اور اس کا راستہ روکنے میں اپنی حد تک کوئی کسر نہ اٹھا رکھیں گی۔ رہی دوسری صورت تو اس میں بلاشبہ اس کا امکان تو ضرور ہے کہ قوموں کے دل اور دماغ خود بخود اس کی اصولی دعوت سے مسخر ہوتے چلے جائیں اور اسے مزاحمتوں کو راستے سے ہٹانے میں بہت تھوڑی قوت استعمال کرنی پڑے، لیکن یہ یاد رہنا چاہیے کہ دل صرف چند خوش آیند موعودوں ہی سے مسخر نہیں ہو جایا کرتے بلکہ انھیں مسخر کرنے کے لیے وہ حقیقی خیر خواہی، نیک نیتی، راستبازی، بے غرضی، فراخ دلی، فیاضی، ہمدردی، اور شرافت و عدالت درکار ہے جو جنگ اور صلح، فتح اور شکست، دوستی اور دشمنی، تمام حالات کی کڑی آزمائشوں میں کھری اور بے لوث ثابت ہو، اور یہ چیز اخلاق فاضلہ کی اس بلند منزل سے تعلق رکھتی ہے جس کا مقام بنیادی اخلاقیات سے بہت برتر ہے یہی وجہ ہے کہ مجرد بنیادی اخلاقیات اور مادی طاقت کے بل پر اٹھنے والے خواہ کھلے قوم پرست ہوں یا پوشیدہ قوم پرستی کے ساتھ کچھ عالمگیر اصولوں کی دعوت وحمایت کا ڈھونگ رچائیں، آخر کار اُن کی ساری جد و جہد اور کشمکش خالص شخصی یا طبقاتی یا قومی خود غرضی ہی پر آ ٹھیرتی ہے جیسا کہ آج آپ امریکہ، اور برطانیہ اور روس کی سیاست خارجیہ میں نمایاں طور پر دیکھ سکتے ہیں۔ ایسی کشمکش میں یہ ایک بالکل فطری امر ہے کہ ہر قوم دوسری قوم کے مقابلہ میں ایک مضبوط چٹان بن کر کھڑی ہو جائے اور اپنی پوری اخلاقی و مادی طاقت اس کی مزاحمت میں صرف کر دے اور اپنے حدود میں اس کو ہرگز راہ دینے کے لیے تیار نہ ہو جب تک کہ مخالف کی برتر مادی قوت اس کو بے بس کر کے نہ رکھ دے۔

اچھا، اب ذرا تصور کیجیے کہ اسی ماحول میں ایک ایسا گروہ (خواہ وہ ابتداءً ایک ہی قوم میں سے اٹھا ہو، مگر قوم کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک "جماعت" کی حیثیت سے اٹھا ہو) پایا جاتا ہے، جو شخصی، طبقاتی اور قومی خود غرضیوں سے بالکل پاک ہے۔ اس کی سعی و جہد کی کوئی غرض اس کے سوا نہیں ہے کہ وہ نوع انسانی کی فلاح چند اصولوں کی پیروی میں دیکھتا ہے اور انسانی زندگی کا نظام ان پر قائم کرنا چاہتا ہے۔ ان اصولوں پر جو سوسائٹی وہ بناتا ہے اس میں قومی و وطنی اور طبقاتی و نسلی امتیازات بالکل مفقود ہیں۔ تمام انسان اس میں یکساں حقوق اور مساوی حیثیت سے شامل ہو سکتے ہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس میں رہنمائی و قیادت کا منصب ہر اس شخص یا مجموعۂ اشخاص کو حاصل ہو سکتا ہے جو ان اصولوں کی پیروی میں سب پر فوقیت لے جائے قطع نظر اس سے کہ اس کی نسلی و وطنی قومیت کچھ ہی ہو، حتیٰ کہ اس میں اس امر کا بھی امکان ہے کہ اگر مفتوح ایمان لا کر اپنے آپ کو صالح تر ثابت کر دے تو فاتح اپنی سرفروشیوں اور جانفشانیوں کے سارے ثمرات اس کے قدموں میں لا کر رکھ دے اور اس کو امام مان کر خود مقتدی بننا قبول کر لے۔ یہ گروہ جب اپنی دعوت لے کر اٹھتا ہے تو وہ لوگ جو اس کے اصولوں کو چلنے دینا نہیں چاہتے، اس کی مزاحمت کرتے ہیں اور اس طرح فریقین میں کشمکش شروع ہو جاتی ہے مگر اس کشمکش میں جتنی شدت بڑھتی جاتی ہے یہ گروہ اپنے مخالفوں کے مقابلہ میں اتنے ہی زیادہ افضل و اشرف اخلاق کا ثبوت دیتا چلا جاتا ہے۔ وہ اپنے طرزِ عمل سے ثابت کر دیتا ہے کہ واقعی وہ خلق اللہ کی بھلائی کے سوا کوئی دوسری غرض پیش نظر نہیں رکھتا۔ اس کی دشمنی اپنے مخالفوں کی ذات یا قومیت سے نہیں بلکہ صرف ان کی ضلالت و گمراہی سے ہے جسے وہ چھوڑ دیں تو وہ اپنے خون کے پیاسے دشمن کو بھی سینے سے لگا سکتا ہے۔ اسے لالچ ان کے مال و دولت یا ان کی تجارت و صنعت کا نہیں بلکہ خود انہی کی اخلاقی و روحانی فلاح کا ہے جو حاصل ہو جائے تو ان کی دولت انہی کو مبارک رہے۔ وہ سخت سے سخت آزمائش کے موقعوں پر جھوٹ، دغا اور مکر و فریب سے کام نہیں لیتا، ٹیڑھی چالوں کا جواب بھی سیدھی تدبیروں سے دیتا ہے۔ انتقام کے جوش میں بھی ظلم و زیادتی پر آمادہ نہیں ہوتا۔ جنگ کے سخت لمحوں میں بھی اپنے ان اصولوں کی پیروی نہیں چھوڑتا جن کی دعوت دینے کے لیے وہ اٹھا ہے۔ سچائی، وفائے عہد اور حسنِ معاملت پر ہر حال میں قائم رہتا ہے۔ بے لاگ انصاف کرتا ہے اور امانت و دیانت کے اس معیار پر پورا اترتا ہے جسے ابتداءً اس نے دنیا کے سامنے معیار کی حیثیت سے پیش کیا تھا۔ مخالفین کی زانی، شرابی، جواری اور سنگدل بے رحم فوجوں سے جب اس گروہ کے خدا ترس، پاک باز، عبادت گذار، نیک دل اور رحیم و کریم مجاہدین کا مقابلہ پیش آتا ہے تو فرداً فرداً ان کی انسانیت اُن کی درندگی و حیوانیت پر فائق نظر آتی ہے۔ وہ ان کے پاس زخمی یا قیدی بن کر آتے ہیں تو یہاں ہر طرف نیکی شرافت اور پاکیزگیٔ اخلاق کا ماحول دیکھ کر ان کی آلودۂ نجاست روحیں بھی پاک ہونے لگتی ہیں، اور یہ وہاں گرفتار ہو جاتے ہیں تو ان کا جوہرِ انسانیت اس تاریک ماحول میں اور زیادہ چمک اٹھتا ہے۔ ان کو کسی علاقے پر غلبہ حاصل ہوتا ہے تو مفتوح آبادی کو انتقام کی جگہ عفو، ظلم و جور کی جگہ رحم و انصاف، شقاوت کی جگہ ہمدردی، تکبر و نخوت کی جگہ حلم و تواضع، گالیوں کی جگہ دعوتِ خیر، جھوٹے پروپیگنڈوں کی جگہ اصولِ حق کی تبلیغ کا تجربہ ہوتا ہے اور وہ یہ دیکھ کر عش عش کرنے لگتے ہیں کہ فاتح سپاہی نہ ان سے عورتیں مانگتے ہیں، نہ دبے چھپے مال ٹٹولتے پھرتے ہیں، نہ ان کے صنعتی رازوں کا سراغ لگاتے ہیں، نہ ان کی معاشی طاقت کو کچلنے کی فکر کرتے ہیں، نہ ان کی قومی عزت کو ٹھوکر مارتے ہیں بلکہ انھیں اگر کچھ فکر ہے تو یہ کہ جو ملک اب ان کے چارج میں ہے اس کے باشندوں میں سے کسی کی عصمت خراب نہ ہو، کسی کے مال کو نقصان نہ پہنچے، کوئی اپنے جائز حقوق سے محروم نہ ہو، کوئی بد اخلاقی ان کے درمیان پرورش نہ پا سکے اور اجتماعی ظلم و جور کسی شکل میں بھی وہاں باقی نہ رہے۔ بخلاف اس کے جب فریق مخالف کسی علاقہ میں گھس آتا ہے تو ساری آبادی اُس کی زیادتیوں، بے رحمیوں سے چیخ اٹھتی ہے۔ اب آپ خود ہی اندازہ کر لیں کہ ایسی لڑائی میں قوم پرستانہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لڑائیوں کی بہ نسبت کتنا بڑا فرق واقع ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے مقابلہ میں بالآخر انسانیت کم تر مادی سروسامان کے باوجود اپنے مخالفوں کی آہن پوش حیوانیت کو آخرکار شکست دے کر رہے گی، اخلاق فاضلہ کے ہتھیار توپ و تفنگ سے زیادہ دور مار ثابت ہوں گے، عین حالت جنگ میں دشمن دوستوں میں تبدیل ہوں گے، جسموں سے پہلے دل مسخر ہوں گے، آبادیاں کی آبادیاں لڑے بھڑے بغیر مفتوح ہو جائیں گی، اور یہ صالح گروہ جب ایک مرتبہ مٹھی بھر جمعیت اور تھوڑے سے سروسامان کے ساتھ کام شروع کر دے گا تو رفتہ رفتہ خود مخالف کیمپ ہی سے اس کو جنرل، سپاہی، ماہرین فنون، اسلحہ، رسد، سامان جنگ سب کچھ حاصل ہوتے چلے جائیں گے۔

یہ جو کچھ میں عرض کر رہا ہوں یہ نرا قیاس اور اندازہ نہیں ہے بلکہ اگر آپ کے سامنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے دورِ مبارک کی تاریخی مثال موجود ہو تو آپ پر واضح ہو جائے گا کہ فی الواقع اس سے پہلے یہی کچھ ہو چکا ہے اور آج بھی یہی کچھ ہو سکتا ہے بشرطیکہ کسی میں یہ تجربہ کرنے کی ہمت ہو۔

حضرات! مجھے توقع ہے کہ اس تقریر سے یہ حقیقت آپ کے ذہن نشین ہو گئی ہو گی کہ طاقت کا اصل منبع اخلاقی طاقت ہے اور اگر دنیا میں کوئی منظم گروہ ایسا موجود ہو جو بنیادی اخلاقیات کے ساتھ اسلامی اخلاقیات کا زور بھی اپنے اندر رکھتا ہو تو یہ بات عقلاً محال اور فطرۃً غیر ممکن ہے کہ اس کی موجودگی میں کوئی دوسرا گروہ دنیا کی امامت و قیادت پر قابض رہ سکے۔ اس کے ساتھ مجھے امید ہے کہ آپ نے یہ بھی اچھی طرح سمجھ لیا ہو گا کہ مسلمانوں کی موجودہ پست حالی کا اصل سبب کیا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ جو لوگ نہ مادی وسائل سے کام لیں، نہ بنیادی اخلاقیات سے آراستہ ہوں اور نہ اجتماعی طور پر ان کے اندر اسلامی اخلاقیات ہی پائے جائیں وہ کسی طرح امامت کے منصب پر فائز نہیں رہ سکتے اور خدا کی اٹل بے لاگ سنت کا تقاضا یہی ہے کہ ان پر ایسے کافروں کو ترجیح دی جائے جو اسلامی اخلاقیات سے عاری سہی مگر کم از کم بنیادی اخلاقیات اور مادی وسائل کے استعمال میں تو اپنے آپ کو ان کی بہ نسبت انتظام دنیا کے لیے اہل تر ثابت کر رہے ہیں۔ اس معاملہ میں اگر آپ کو کوئی شکایت ہو تو سنت اللہ سے نہیں بلکہ اپنے آپ سے ہونی چاہیے اور اس شکایت کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ آپ اب اپنی اس خامی کو دور کرنے کی فکر کریں جس نے آپ کو امام سے مقتدی اور پیش رو سے پس رو بنا کر چھوڑا ہے۔

اس کے بعد ضرورت ہے کہ میں صاف اور واضح طریقہ سے آپ کے سامنے اسلامی اخلاقیات کی بنیادوں کو بھی پیش کر دوں، کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ اس معاملہ میں عام طور پر مسلمانوں کے تصورات بری طرح الجھے ہوئے ہیں اور اس الجھن کی وجہ سے بہت ہی کم آدمی یہ جانتے ہیں کہ اسلامی اخلاقیات فی الواقع کس چیز کا نام ہے اور اس پہلو سے انسان کی تربیت و تکمیل کے لیے کیا چیزیں کس ترتیب و تدریج کے ساتھ اس کے اندر پرورش کی جانی چاہییں۔

قرآن اور حدیث کی رو سے جس چیز کو ہم اسلامی اخلاقیات کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں وہ دراصل چار مراتب پر مشتمل ہے: ایمانؔ، اسلامؔ، تقویٰؔ، اور احسانؔ۔ یہ چاروں مراتب یکے بعد دیگرے اس فطری ترتیب پر واقع ہیں کہ ہر بعد کا مرتبہ پہلے مرتبے سے پیدا اور لازماً اسی پر قائم ہوتا ہے، اور جب تک نیچے والی منزل پختہ و محکم نہ ہو جائے دوسری منزل کی تعمیر کا تصور تک نہیں کیا جا سکتا۔ اس پوری عمارت میں ایمان کو بنیادی حیثیت حاصل ہے، اس بنیاد پر اسلام کی منزل تعمیر ہوتی ہے، پھر اس کے اوپر تقویٰ اور سب کے اوپر احسان کی منزلیں اٹھتی ہیں۔ ایمان نہ ہو تو اسلام و تقویٰ یا احسان کا سرے سے کوئی امکان ہی نہیں۔ ایمان کمزور ہو تو اس پر کسی بالائی منزل کا بوجھ نہیں ڈالا جا سکتا، یا ایسی کوئی منزل تعمیر کر بھی دی جائے تو وہ بودی اور متزلزل ہو گی۔ ایمان محدود ہو تو جتنے حدود میں وہ محدود ہو گا، اسلام، تقویٰ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور احسان بھی بس انہی حدود تک محدود رہیں گے۔ پس جب تک ایمان پوری طرح صحیح، پختہ اور وسیع نہ ہو، کوئی مرد عاقل جو دین کا فہم رکھتا ہو، اسلام، تقویٰ یا احسان کی تعمیر کا خیال نہیں کر سکتا۔ اسی طرح تقویٰ سے پہلے اسلام اور احسان سے پہلے تقویٰ کی تصحیح، پختگی اور توسیع ضروری ہے۔ لیکن اکثر ہم دیکھتے ہیں کہ لوگ اس فطری و اصولی ترتیب کو نظر انداز کر کے ایمان و اسلام کی تکمیل کے بغیر تقویٰ و احسان کی باتیں شروع کر دیتے ہیں، اور اس سے بھی زیادہ افسوسناک یہ ہے کہ بالعموم لوگوں کے ذہنوں میں ایمان و اسلام کا ایک نہایت محدود تصور جاگزیں ہے اس وجہ سے وہ سمجھتے ہیں کہ محض وضع قطع، لباس، نشست و برخاست، اکل و شرب اور ایسی ہی چند ظاہری چیزوں کو ایک مقرر نقشے پر ڈھال لینے سے تقویٰ کی تکمیل ہو جاتی ہے، اور پھر عبادات میں نوافل، اذکار، اَوْرَاد اور ایسے ہی بعض اعمال اختیار کر لینے سے احسان کا بلند مقام حاصل ہو جاتا ہے، حالانکہ بسا اوقات اسی تقویٰ اور احسان کے ساتھ ساتھ لوگوں کی زندگیوں میں ایسی صریح علامات بھی نظر آتی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ ابھی ان کا ایمان ہی سرے سے درست اور پختہ نہیں ہوا ہے۔ یہ غلطیاں جب تک موجود ہیں، کسی طرح یہ امید نہیں کی جا سکتی کہ ہم اسلامی اخلاقیات کا نصاب پورا کرنے میں کبھی کامیاب ہو سکیں گے۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ ہمیں ایمان، اسلام، تقویٰ اور احسان کے ان چاروں مراتب کا پورا پورا تصور بھی حاصل ہو اور اس کے ساتھ ہم ان کی فطری ترتیب کو بھی اچھی طرح سمجھ لیں۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلے ایمان کو لیجیے جو اسلامی زندگی کی بنیاد ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ توحید و رسالت کے اقرار کا نام ایمان ہے اگر کوئی شخص اس کا اقرار کرلے تو اس سے وہ قانونی شرط پوری ہو جاتی ہے جو دائرۂ اسلام میں داخل ہونے کے لیے رکھی گئی ہے اور وہ اس کا مستحق ہو جاتا ہے کہ اس کے ساتھ مسلمانوں کا سا معاملہ کیا جائے۔ مگر کیا یہی سادہ اقرار، جو ایک قانونی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے کافی ہے، اس غرض کے لیے بھی کافی ہو سکتا ہے کہ اسلامی زندگی کی ساری سہ منزلہ عمارت صرف اس بنیاد پر قائم ہو سکے؟ لوگ ایسا ہی سمجھتے ہیں اور اسی لیے جہاں یہ اقرار موجود ہوتا ہے وہاں عملی اسلام اور تقویٰ اور احسان کی تعمیر شروع کر دی جاتی ہے جو اکثر ہوائی قلعے سے زیادہ پائیدار ثابت نہیں ہوتی۔ لیکن فی الواقع ایک مکمل اسلامی زندگی کی تعمیر کے لیے یہ ناگزیر ہے کہ ایمان اپنی تفصیلات میں پوری طرح وسیع اور اپنی گہرائی میں اچھی طرح مستحکم ہو۔ اس کی تفصیلات میں سے جو شعبہ بھی چھوٹ جائے گا، اسلامی زندگی کا وہی شعبہ تعمیر ہونے سے رہ جائے گا، اور اس کی گہرائی میں جہاں بھی کسر رہ جائے گی اسلامی زندگی کی عمارت اسی مقام پر بودی ثابت ہوگی۔ مثال کے طور پر ایمان باللہ کو دیکھیے جو دین کی اولین بنیاد ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ خدا کا اقرار اپنی سادہ صورت سے گزر کر جب تفصیلات میں پہنچتا ہے تو اس کی بے شمار صورتیں بن جاتی ہیں۔ کہیں وہ صرف اس حد پر ختم ہو جاتا ہے کہ بے شک خدا موجود ہے اور وہ دنیا کا خالق ہے اور اپنی ذات میں اکیلا ہے۔ کہیں اس کی انتہائی وسعت بس اتنی ہوتی ہے کہ خدا ہمارا معبود ہے اور ہمیں اس کی پرستش کرنی چاہیے۔ کہیں خدا کی صفات اور اس کے حقوق و اختیارات کا تصور کچھ زیادہ وسیع ہو کر بھی وہ اس سے آگے نہیں بڑھتا کہ عالم الغیب، سمیع و بصیر، سمیع الدعوات و قاضی الحاجات اور پرستش کی تمام جزوی شکلوں کا مستحق ہونے میں خدا کا کوئی شریک نہیں ہے، اور یہ کہ "مذہبی معاملات" میں آخری سند خدا ہی کی کتاب ہے ظاہر ہے کہ ان مختلف تصورات سے ایک ہی طرز کی زندگی نہیں بن سکتی بلکہ جو تصور جتنا محدود ہے، عملی زندگی اور اخلاق میں بھی لازماً اسلامی رنگ اتنا ہی محدود ہوگا، حتیٰ کہ جہاں عام مذہبی تصورات کے مطابق ایمان باللہ اپنی انتہائی وسعت پر پہنچ جائے گا وہاں بھی اسلامی زندگی اس سے آگے نہ بڑھ سکے گی کہ خدا کے باغیوں کی وفاداری اور خدا کی وفاداری ایک ہی ساتھ نباہ لی جائے،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یا نظامِ کفر اور نظامِ اسلام کو ملا کر ایک مرکب بنا لیا جائے۔ اسی طرح ایمان باللہ کی گہرائی کا پیمانہ بھی مختلف لوگوں میں مختلف ہے۔ کوئی خدا کا اقرار کرنے کے باوجود اپنی کسی معمولی سے معمولی چیز کو بھی خدا پر قربان کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتا، کوئی بعض چیزوں سے خدا کو عزیز تر رکھتا ہے مگر بعض چیزیں اسے خدا سے عزیز تر ہوتی ہیں، کوئی اپنی جان و مال تک خدا پر قربان کر دیتا ہے مگر اپنے رجحاناتِ نفس اور اپنے نظریات و افکار کی قربانی یا اپنی شہرت کی قربانی اسے گوارا نہیں ہوتی۔ ٹھیک ٹھیک اسی تناسب سے اسلامی زندگی کی پائیداری و ناپائیداری بھی متعین ہوتی ہے، اور انسان کا اسلامی اخلاق ٹھیک اُسی مقام پر دغا دے جاتا ہے جہاں اس کے نیچے ایمان کی بنیاد کمزور رہ جاتی ہے۔ ایک مکمل اسلامی زندگی کی عمارت اگر اٹھ سکتی ہے تو صرف اُسی اقرارِ توحید پر اٹھ سکتی ہے جو انسان کی پوری انفرادی و اجتماعی زندگی پر وسیع ہو، جس کے مطابق انسان اپنے آپ کو اور اپنی ہر چیز کو خدا کی ملک سمجھے، اس کو اپنا اور تمام دنیا کا ایک ہی جائز مالک، معبود، مطاع اور صاحبِ امر و نہی تسلیم کرے، اسی کو ہدایت کا سرچشمہ مانے، اور پورے شعور کے ساتھ اس حقیقت پر مطمئن ہو جائے کہ خدا کی اطاعت سے انحراف، یا اس کی ہدایت سے بے نیازی، یا اس کی ذات و صفات اور حقوق و اختیارات میں غیر کی شرکت جس پہلو اور جس رنگ میں بھی ہے سراسر ضلالت ہے۔ پھر اس عمارت میں استحکام اگر پیدا ہو سکتا ہے تو صرف اس وقت ہو سکتا ہے کہ آدمی پورے شعور اور پورے ارادے کے ساتھ یہ فیصلہ کر لے کہ وہ اور اس کا سب کچھ اللہ کا ہے اور اللہ ہی کے لیے ہے۔ اپنے معیارِ پسند اور ناپسند کو ختم کر کے اللہ کی پسند و ناپسند کے تابع کر دے۔ اپنی خودسری کو مٹا کر اپنے نظریات، خیالات، خواہشات، جذبات، اور اندازِ فکر کو اُس علم کے مطابق ڈھال لے جو خدا نے اپنی کتاب میں دیا ہے۔ اپنی تمام ان وفاداریوں کو دریا بُرد کر دے جو خدا کی وفاداری کی تابع نہیں بلکہ اس کی مدِ مقابل بن سکتی ہوں۔ اپنے دل میں سب سے بلند مقام پر خدا کی محبت کو بٹھائے اور ہر اس بت کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر نہاں خانۂ دل سے نکال پھینکے جو خدا کے مقابلہ میں عزیز تر ہونے کا مطالبہ کرتا ہو۔ اپنی محبت اور نفرت، اپنی دوستی اور دشمنی، اپنی رغبت اور کراہیت، اپنی صلح اور جنگ ہر چیز کو خدا کی مرضی میں اس طرح گم کر دے کہ اس کا نفس وہی چاہنے لگے جو خدا چاہتا ہے اور اس سے بھاگنے لگے جو خدا کو ناپسند ہے۔ یہ ہے ایمان باللہ کا حقیقی مرتبہ، اور آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ جہاں ایمان ہی ان حیثیات سے اپنی وسعت و ہمہ گیری اور اپنی پختگی و مضبوطی میں ناقص ہو وہاں تقویٰ یا احسان کا کیا امکان ہو سکتا ہے۔ کیا اس نقص کی کسر ڈاڑھیوں کے طول اور لباس کی تراش خراش یا تسبیح گردانی و تہجد خوانی سے پوری کی جا سکتی ہے؟

اس پر دوسرے ایمانیات کو بھی قیاس کر لیجیے۔ نبوت پر ایمان اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک انسان کا نفس زندگی کے سارے معاملات میں نبی کو اپنا رہنما نہ ان لے اور اس کی رہنمائی کے خلاف یا اس سے آزاد جتنی رہنمائیاں ہوں ان کو رد نہ کر دے۔ کتاب پر ایمان اس وقت تک ناقص ہی رہتا ہے جب تک نفس میں کتاب اللہ کے بتائے ہوئے اصولِ زندگی کے سوا کسی دوسری چیز کے تسلط پر رضامندی کا شائبہ بھی باقی ہو یا اتباعِ ما انزل اللہ کو اپنی اور ساری دنیا کی زندگی کا قانون دیکھنے کے لیے قلب و روح کی بےچینی میں کچھ بھی کسر ہو۔ اسی طرح آخرت پر ایمان بھی مکمل نہیں کہا جا سکتا جب تک نفس پوری طرح آخرت کو دنیا پر ترجیح دینے اور اخروی قدروں کے مقابلہ میں دنیوی قدروں کو ٹھکرا دینے پر آمادہ نہ ہو جائے اور آخرت کی جواب دہی کا خیال اسے زندگی کی ہر راہ پر چلتے ہوئے قدم قدم پر کھٹکنے نہ لگے۔ یہ بنیادیں ہی جہاں پوری طرح موجود نہ ہوں آخر وہاں اسلامی زندگی کی عالیشان عمارت کس شے پر تعمیر ہوگی۔ جب لوگوں نے ان بنیادوں کی توسیع و تکمیل اور پختگی کے بغیر ہی تعمیرِ اخلاقِ اسلامی کو ممکن سمجھا تب ہی تو نوبت یہاں تک پہنچی کہ کتاب اللہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے خلاف فیصلہ کرنے والے جج، غیر شرعی قوانین کی بنیاد پر مقدمے لڑانے والے وکیل، نظامِ کفر کے ماتحت معاملاتِ زندگی کا انتظام کرنے والے کارکن، کافرانہ اصولِ تمدن و سیاست پر زندگی کی تشکیل و تاسیس کے لیے لڑنے والے لیڈر اور ہیرو، غرض سب کے لیے تقویٰ و احسان کے مراتبِ عالیہ کا دروازہ کھل گیا بشرطیکہ یہ اپنی زندگی کے ظاہری انداز و اطوار کو ایک خاص نقشے پر ڈھال لیں، اور کچھ نوافل و اذکار کی عادت ڈال لیں۔

ایمان کی یہ بنیادیں، جن کا ابھی میں نے آپ سے ذکر کیا ہے، جب مکمل اور گہری ہو جاتی ہیں، تب ان پر اسلام کی منزل تعمیر ہوتی ہے۔ اسلام دراصل ایمان کے عملی ظہور کا دوسرا نام ہے۔ ایمان اور اسلام کا باہمی تعلق ویسا ہی ہے جیسا بیج اور درخت کا تعلق ہوتا ہے۔ بیج میں جو کچھ اور جیسا کچھ موجود ہوتا ہے وہی درخت کی شکل میں ظاہر ہو جاتا ہے، حتیٰ کہ درخت کا امتحان کر کے بآسانی یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ بیج میں کیا تھا اور کیا نہ تھا۔ آپ یہ تصور کر سکتے ہیں کہ بیج نہ ہو اور درخت موجود ہو، اور نہ یہی ممکن ہے کہ بیج زمین میں ہو اور پھر بھی درخت پیدا نہ ہو۔ ایسا ہی معاملہ ایمان اور اسلام کا ہے۔ جہاں ایمان موجود ہوگا، لازماً اس کا ظہور آدمی کی عملی زندگی میں، اخلاق میں، برتاؤ میں، تعلقات میں، چلنے پھرنے میں، دوڑ دھوپ کے رخ میں، مذاق و مزاج کی افتاد میں، سعی و جہد کے راستوں میں، اوقات اور قوتوں اور قابلیتوں کے مصرف میں، غرض مظاہرِ زندگی کے ہر ہر جز میں ہو کر رہے گا۔ ان میں سے جس پہلو میں بھی اسلام کے بجائے غیر اسلام ظاہر ہو رہا ہو، یقین کر لیجیے کہ اس پہلو میں ایمان موجود نہیں ہے یا ہے تو بالکل بودا اور بے جان ہے، اور اگر عملی زندگی ساری کی ساری ہی غیر مسلمانہ شان سے بسر ہو رہی ہو، تو جان لیجیے کہ دل ایمان سے خالی ہے یا زمین اتنی بنجر ہے کہ ایمان کا بیج برگ و بار نہیں لا رہا ہے۔ بہرحال میں نے جہاں تک قرآن اور حدیث کو سمجھا ہے، یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ دل میں ایمان ہو اور عمل میں اسلام نہ ہو۔

(اس موقع پر ایک صاحب نے اٹھ کر پوچھا کہ ایمان اور عمل کو آپ ایک ہی چیز سمجھتے ہیں یا ان دونوں میں کچھ فرق ہے۔ اس کے جواب میں کہا:)

آپ تھوڑی دیر کے لیے اپنے ذہن سے ان بحثوں کو نکال دیں جو فقہاء اور متکلمین نے اس مسئلہ میں کی ہیں اور قرآن سے اس معاملہ کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ قرآن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اعتقادی ایمان اور عملی اسلام لازم و ملزوم ہیں۔ اللہ تعالیٰ جگہ جگہ ایمان اور عملِ صالح کا ساتھ ساتھ ذکر کرتا ہے اور تمام اچھے وعدے جو اس نے اپنے بندوں سے کیے ہیں انہی لوگوں سے متعلق ہیں جو اعتقاداً مومن اور عملاً مسلم ہوں۔ پھر آپ دیکھیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے جہاں جہاں منافقین کو پکڑا ہے وہاں ان کے عمل ہی کی خرابیوں سے ان کے ایمان کے نقص پر دلیل قائم کی ہے اور عملی اسلام ہی کو حقیقی ایمان کی علامت ٹھیرایا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ قانونی لحاظ سے کسی شخص کو کافر ٹھیرانے اور ملت سے اس کا رشتہ کاٹنے کا معاملہ دوسرا ہے اور اس میں انتہائی احتیاط ملحوظ رہنی چاہیے، مگر میں یہاں اس ایمان و اسلام کا ذکر نہیں کر رہا ہوں جس پر دنیا میں فقہی احکام مترتب ہوتے ہیں، بلکہ یہاں ذکر اس ایمان و اسلام کا ہے جو خدا کے ہاں معتبر ہے اور جس پر اخروی نتائج مترتب ہونے والے ہیں۔ قانونی نقطۂ نظر کو چھوڑ کر حقیقت نفس الامری کے لحاظ سے اگر آپ دیکھیں گے تو یقیناً یہی پائیں گے کہ جہاں عملاً خدا کے آگے سپر اندازی اور سپردگی و حوالگی میں کمی ہے، جہاں نفس کی پسند خدا کی پسند سے مختلف ہے، جہاں خدا کی وفاداری کے ساتھ غیر کی وفاداری نبھ رہی ہے، جہاں اقامتِ دین کی سعی کے بجائے دوسرے مشاغل میں انہماک ہے، جہاں کوششیں اور محنتیں راہِ خدا کے بجائے دوسری راہوں میں صرف ہو رہی ہیں، وہاں ضرور ایمان میں نقص ہے اور ظاہر ہے کہ ناقص ایمان پر تقویٰ اور احسان کی تعمیر نہیں ہو سکتی خواہ ظاہر کے اعتبار سے متقیوں کی سی وضع بنانے اور محسنین کے بعض اعمال کی نقل اتارنے کی کتنی ہی کوشش کی جائے۔ ظاہر فریب شکلیں اگر حقیقت کی روح سے خالی ہوں تو ان کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے ایک نہایت خوبصورت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آدمی کی لاش بہترین وضع و ہیئت میں موجود ہو مگر اس میں جان نہ ہو۔ اس خوبصورت لاش کی ظاہری شان سے دھوکا کھا کر آپ کچھ توقعات اس سے وابستہ کریں گے تو واقعات کی دنیا اپنے پہلے ہی امتحان میں اس کا ناکارہ ہونا ثابت کر دے گی اور تجربے سے آپ کو خود ہی معلوم ہو جائے گا کہ ایک بدصورت مگر زندہ انسان ایک خوبصورت مگر بے روح لاش سے بہرحال زیادہ کارگر ہوتا ہے۔ ظاہر فریبیوں سے آپ اپنے نفس کو تو ضرور دھوکا دے سکتے ہیں، لیکن عالم واقعہ پر کچھ بھی اثر نہیں ڈال سکتے اور نہ خدا کی میزان ہی میں کوئی وزن حاصل کر سکتے ہیں۔ پس اگر آپ کو ظاہری نہیں بلکہ وہ حقیقی تقویٰ اور احسان مطلوب ہو جو دنیا میں دین کا بول بالا کرنے اور آخرت میں خیر کا پلڑا جھکانے کے لیے درکار ہے، تو میری اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیجیے کہ اوپر کی یہ دونوں منزلیں کبھی نہیں اٹھ سکتیں جب تک ایمان کی بنیاد مضبوط نہ ہو جائے اور اس کی مضبوطی کا ثبوت عملی اسلام یعنی بالفعل اطاعت و فرمانبرداری سے نہ مل جائے۔

تقویٰ کی بات کرنے سے پہلے یہ سمجھنے کی کوشش کیجیے کہ تقویٰ ہے کیا چیز۔ تقویٰ حقیقت میں کسی وضع و ہیئت اور کسی خاص طرزِ معاشرت کا نام نہیں ہے بلکہ دراصل وہ نفس کی اس کیفیت کا نام ہے جو خدا ترسی اور احساسِ ذمہ داری سے پیدا ہوتی ہے اور زندگی کے ہر پہلو میں ظہور کرتی ہے۔ حقیقی تقویٰ یہ ہے کہ انسان کے دل میں خدا کا خوف ہو، عبدیت کا شعور ہو، خدا کے سامنے اپنی ذمہ داری و جواب دہی کا احساس ہو، اور اس بات کا زندہ ادراک موجود ہو کہ دنیا ایک امتحان گاہ ہے جہاں خدا نے ایک مہلتِ عمر دے کر مجھے بھیجا ہے اور آخرت میں میرے مستقبل کا فیصلہ بالکل اس چیز پر منحصر ہے کہ میں اس دیے ہوئے وقت کے اندر اس امتحان گاہ میں اپنی قوتوں اور قابلیتوں کو کس طرح استعمال کرتا ہوں، اس سرو سامان میں کس طرح تصرف کرتا ہوں جو مشیت الٰہی کے تحت مجھے دیا گیا ہے، اور ان انسانوں کے ساتھ کیا معاملہ کرتا ہوں جن سے قضائے الٰہی نے مختلف حیثیتوں سے میری زندگی متعلق کر دی ہے۔ یہ احساس و شعور جس شخص کے اندر پیدا ہو جائے اس کا ضمیر بیدار ہو جاتا ہے، اس کی دینی حس تیز ہو جاتی ہے، اس کو ہر وہ چیز کھٹکنے لگتی ہے جو خدا کی رضا کے خلاف ہو، اس کے مذاق کو ہر وہ شے ناگوار ہونے لگتی ہے جو خدا کی پسند سے مختلف ہو۔ وہ اپنے نفس کا آپ جائزہ لینے لگتا ہے کہ میرے اندر کس قسم کے رجحانات و میلانات پرورش پا رہے ہیں۔ وہ اپنی زندگی کا خود محاسبہ کرنے لگتا ہے کہ میں کن کاموں میں اپنا وقت اور اپنی قوتیں صرف کر رہا ہوں۔ وہ صریح ممنوعات کو تو درکنار، مشتبہ امور میں بھی مبتلا ہوتے ہوئے خود بخود جھجکنے لگتا ہے۔ اس کا احساسِ فرض اسے مجبور کر دیتا ہے کہ تمام اوامر کو پوری فرمانبرداری کے ساتھ بجا لائے۔ اس کی خدا ترسی ہر اس موقع پر اس کے قدم میں لرزش پیدا کر دیتی ہے جہاں حدود اللہ سے تجاوز کا اندیشہ ہو۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد کی نگہداشت آپ سے آپ اس کا وتیرہ بن جاتی ہے اور اس خیال سے بھی اس کا ضمیر کانپ اٹھتا ہے کہ کہیں اس سے کوئی بات حق کے خلاف سرزد نہ ہو جائے۔ یہ کیفیت کسی ایک شکل یا کسی مخصوص دائرۂ عمل میں ہی ظاہر نہیں ہوتی بلکہ آدمی کے پورے طرزِ فکر اور اس کے تمام کارنامۂ زندگی میں اس کا ظہور ہوتا ہے اور اس کے اثر سے ایک ایسی ہموار و یک رنگ سیرت پیدا ہوتی ہے جس میں آپ ہر پہلو سے ایک ہی طرز کی پاکیزگی و صفائی پائیں گے۔ بخلاف اس کے جہاں تقویٰ اس چیز کا نام لیا گیا ہے کہ آدمی چند مخصوص شکلوں کی پابندی اور مخصوص طریقوں کی پیروی اختیار کرنے اور مصنوعی طور پر اپنے آپ کو ایک ایسے سانچے میں ڈھال لے جس کی پیمائش کی جا سکتی ہو، وہاں آپ دیکھیں گے کہ وہ چند اشکالِ تقویٰ جو گنا دی گئی ہیں، ان کی پابندی تو انتہائی اہتمام کے ساتھ ہو رہی ہے۔ مگر اس کے ساتھ زندگی کے دوسرے پہلوؤں میں وہ اخلاق، وہ طرزِ فکر اور وہ طرزِ عمل بھی ظاہر ہو رہے ہیں جو مقامِ تقویٰ تو درکنار، ایمان کے ابتدائی مقتضیات سے بھی مناسبت نہیں رکھتے، یعنی حضرت مسیحؑ کی تمثیلی زبان میں مچھر چھانے جا رہے ہیں اور اونٹ ... ساتھ نگلے جا رہے ہیں۔

حقیقی تقویٰ اور مصنوعی تقویٰ کے اس فرق کو یوں سمجھیے کہ ایک شخص تو وہ ہے جس کے اندر طہارت و نظافت کی حس موجود ہے اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پاکیزگی کا ذوق پایا جاتا ہے۔ ایسا شخص گندگی سے فی نفسہٖ نفرت کرے گا خواہ وہ جس شکل میں بھی ہو اور طہارت کو بجائے خود اختیار کرے گا خواہ اس کے مظاہر کا احاطہ نہ ہو سکتا ہو۔ بخلاف اس کے ایک دوسرا شخص ہے جس کے اندر طہارت کی حس موجود نہیں ہے مگر وہ گندگیوں اور طہارتوں کی ایک فہرست لیے پھرتا ہے جو کہیں سے اس نے نقل کر لی ہیں۔ یہ شخص ان گندگیوں سے تو سخت اجتناب کرے گا جو اس کی فہرست میں لکھی ہوئی ہیں، مگر بے شمار ایسی گھناؤنی چیزوں میں آلودہ پایا جائے گا جو ان گندگیوں سے بدرجہا زیادہ ناپاک ہوں گی جس سے وہ بچ رہا ہے صرف اس وجہ سے کہ وہ اس کی فہرست میں درج ہونے سے رہ گئیں۔ یہ فرق جو میں آپ سے عرض کر رہا ہوں، یہ محض ایک نظری فرق نہیں ہے بلکہ آپ اس کو اپنی آنکھوں سے ان حضرات کی زندگیوں میں دیکھ سکتے ہیں جن کے تقویٰ کی دھوم مچی ہوئی ہے۔ ایک طرف ان کے ہاں جزئیاتِ شرع کا یہ اہتمام ہے کہ داڑھی ایک خاص مقدار سے کچھ بھی کم ہو تو فسق کا فیصلہ نافذ کر دیا جاتا ہے، پائنچہ ٹخنے سے ذرا نیچے ہو جائے تو جہنم کی وعید سنا دی جاتی ہے، اپنے مسلک فقہی کے فروعی احکام سے ہٹنا ان کے نزدیک گویا دین سے نکل جانا ہے، لیکن دوسری طرف دین کے اصول و کلیات سے ان کی غفلت اس حد کو پہنچی ہوئی ہے کہ مسلمانوں کی پوری زندگی کا مدار انھوں نے رخصتوں اور سیاسی مصلحتوں پر رکھ دیا ہے، اقامتِ دین کی سعی سے گریز کی بے شمار راہیں انھوں نے نکال رکھی ہیں، غلبۂ کفر کے تحت "اسلامی زندگی" کے نقشے بنانے ہی میں ان کی ساری محنتیں اور کوششیں صرف ہو رہی ہیں، اور ان ہی کی غلط رہنمائی نے مسلمانوں کو اس چیز پر مطمئن کیا ہے کہ ایک غیر اسلامی نظام کے اندر رہتے ہوئے، بلکہ اس کی خدمت کرتے ہوئے بھی ایک محدود دائرے میں مذہبی زندگی بسر کر کے وہ دین کے سارے تقاضے پورے کر سکتے ہیں اور اس سے آگے کچھ مطلوب نہیں ہے جس کے لیے وہ سعی کریں۔ پھر اس سے بھی زیادہ افسوس ناک بات یہ ہے کہ اگر کوئی ان کے سامنے دین کے اصلی مطالبے پیش کرے اور سعی اقامتِ دین کی طرف توجہ دلائے تو صرف یہی نہیں کہ وہ اس کی بات سنی ان سنی کر دیتے ہیں بلکہ کوئی حیلہ، کوئی بہانہ اور کوئی چال ایسی نہیں چھوڑتے جو اس کام سے خود بچنے اور مسلمانوں کو بچانے کے لیے استعمال نہ کریں۔ اس پر بھی ان کے تقویٰ پر کوئی آنچ نہیں آتی اور نہ مذہبی ذہنیت رکھنے والوں میں سے کسی کو یہ شک ہوتا کہ ان کے تقویٰ میں کوئی کسر ہے۔ اس کے علاوہ حقیقی اور مصنوعی تقویٰ کا فرق بے شمار دوسری شکلوں میں بھی ظاہر ہوتا رہتا ہے جسے آپ محسوس کر سکتے ہیں بشرطیکہ تقویٰ کا اصلی تصور آپ کے ذہن میں واضح طور پر موجود ہو۔

میری ان باتوں کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ وضع قطع، لباس اور معاشرت کے ظاہری پہلوؤں کے متعلق جو آداب و احکام حدیث سے ثابت ہیں، میں ان کا استخفاف کرنا چاہتا ہوں، یا انھیں غیر ضروری قرار دیتا ہوں۔ خدا کی پناہ اس سے کہ میرے دل میں ایسا کوئی خیال ہو۔ دراصل جو کچھ میں آپ کے ذہن نشین کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اصل شے حقیقتِ تقویٰ ہے نہ کہ مظاہر۔ حقیقتِ تقویٰ جس کے اندر پیدا ہو گی تو اس کی پوری زندگی ہمواری و یک رنگی کے ساتھ اسلامی زندگی بنے گی اور اسلام اپنی پوری ہمہ گیری کے ساتھ اس کے خیالات میں، اس کے جذبات و رجحانات میں، اس کے مذاقِ طبیعت میں، اس کے اوقات کی تقسیم اور اس کی قوتوں کے مصارف میں، اس کی سعی کی راہوں میں، اس کے طرزِ زندگی اور معاشرت میں، اس کی کمائی اور خرچ میں، غرض اس کی حیاتِ دنیوی کے سارے ہی پہلوؤں میں رفتہ رفتہ نمایاں ہوتا چلا جائے گا۔ بخلاف اس کے اگر مظاہر کو حقیقت پر مقدم رکھا جائے گا اور ان پر بے جا زور دیا جائے گا اور حقیقی تقویٰ کی تخم ریزی و آبیاری کے بغیر مصنوعی طور پر چند ظاہری احکام کی تعمیل کرا دی جائے گی تو نتائج وہی کچھ ہوں گے جن کا میں نے ابھی آپ سے ذکر کیا ہے۔ پہلی چیز دیر طلب اور صبر آزما ہے، بتدریج نشوونما پاتی اور ایک مدت کے بعد برگ و بار لاتی ہے، جس طرح بیج سے درخت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے پیدا ہونے اور پھل پھول لانے میں کافی دیر لگا کرتی ہے، اسی لیے کچی مزاج کے لوگ اس سے گھبراتے ہیں۔ بخلاف اس کے دوسری چیز جلدی اور آسانی سے پیدا کرلی جاتی ہے، جیسے ایک لکڑی میں پتے اور پھل اور پھول باندھ کر درخت کی سی شکل بنادی جائے، یہی وجہ ہے کہ تکلف کی پیداوار کا یہی ڈھنگ آج مقبول ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ جو توقعات ایک فطری درخت سے پوری ہوتی ہیں وہ اس قسم کے مصنوعی درختوں سے کبھی پوری نہیں ہوسکتیں۔

اب احسان کو لیجیے جو اسلام کی بلند ترین منزل ہے۔ احسان دراصل اللہ اور اس کے رسول اور اس کے دین کے ساتھ اس شدید لگاؤ، اس گہری محبت، اس سچی وفاداری اور فدویت و جاں نثاری کا نام ہے جو مسلمان کو فنا فی الاسلام کردے۔ تقویٰ کا اساسی تصور خدا کا خوف ہے جو انسان کو اس کی ناراضی سے بچنے پر آمادہ کرے اور احسان کا اساسی تصور خدا کی محبت ہے جو آدمی کو اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ابھارے۔ ان دونوں چیزوں کے فرق کو ایک مثال سے یوں سمجھیے کہ حکومت کے ملازموں میں سے ایک تو وہ لوگ ہیں جو نہایت فرض شناسی و تن دہی سے وہ تمام خدمات ٹھیک ٹھیک بجا لاتے ہیں جو ان کے سپرد کی گئی ہوں، تمام ضابطوں اور قاعدوں کی پوری پوری پابندی کرتے ہیں اور کوئی ایسا کام نہیں کرتے جو حکومت کے لیے قابل اعتراض ہو۔ دوسرا طبقہ ان مخلص وفاداروں اور دل و جاں نثاروں کا ہوتا ہے جو دل و جان سے حکومت کے ہواخواہ ہوتے ہیں، صرف وہی خدمات انجام نہیں دیتے جو ان کے سپرد کی گئی ہوں بلکہ ان کے دل کو ہمیشہ یہ فکر لگی رہتی ہے کہ سلطنت کے مفاد کو زیادہ سے زیادہ کس طرح ترقی دی جائے، اور اس دھن میں فرض اور مطالبہ سے زائد کام کرتے ہیں، سلطنت پر کوئی آنچ آئے تو وہ جان و مال اور اولاد سب کچھ قربان کرنے کے لیے آمادہ ہوجاتے ہیں، قانون کی کہیں خلاف ورزی ہو تو ان کے دل کو چوٹ لگتی ہے، کہیں بغاوت کے آثار پائے جائیں تو وہ بے چین ہوجاتے ہیں اور اسے فرو کرنے میں جان لڑا دیتے ہیں، جان بوجھ کر خود سلطنت کو نقصان پہنچانا تو درکنار اس کے مفاد کو کسی طرح نقصان پہنچتے دیکھنا بھی ان کے لیے ناقابل برداشت ہوتا ہے اور اس خرابی کے رفع کرنے میں وہ اپنی حد تک کوشش کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے۔ ان کی دلی خواہش یہ ہوتی ہے کہ دنیا میں بس ان کی سلطنت ہی کا بول بالا ہو اور زمین کا کوئی چپہ ایسا باقی نہ رہے جہاں اس کا پھریرا نہ اڑے۔ ان دونوں میں سے پہلی قسم کے لوگ حکومت کے متقی ہیں، اور دوسری قسم کے لوگ اس کے محسن۔ اگرچہ ترقیاں متقین کو بھی ملتی ہیں اور بہرحال ان کے نام اچھے ہی ملازموں کی فہرست میں لکھے جاتے ہیں، مگر جو سرفرازیاں محسنین کے لیے ہیں اُن میں کوئی دوسرا ان کا شریک نہیں ہوتا۔ پس اسی مثال پر اسلام کے متقیوں اور محسنوں کو بھی قیاس کرلیجیے۔ اگرچہ متقین بھی قابل قدر اور قابل اعتماد لوگ ہیں، مگر اسلام کی اصلی طاقت محسنین کا گروہ ہے اور وہ اصلی کام جو اسلام دنیا میں کرنا چاہتا ہے اسی گروہ سے بن آسکتا ہے۔

احسان کی اس حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد آپ خود ہی اندازہ کرلیں کہ جو لوگ اپنی آنکھوں سے خدا کے دین کو کفر سے مغلوب دیکھیں، جن کے سامنے حدود اللہ پامال ہی نہیں بلکہ کالعدم کردی جائیں، خدا کا قانون عملاً ہی نہیں بلکہ باضابطہ منسوخ کردیا جائے، خدا کی زمین پر خدا کا نہیں بلکہ اس کے باغیوں کا بول بالا ہورہا ہو، نظام کفر کے تسلط سے نہ صرف عام انسانی سوسائٹی میں اخلاقی و تمدنی فساد برپا ہو بلکہ خود امت مسلمہ بھی نہایت سرعت کے ساتھ اخلاقی و عملی گمراہیوں میں مبتلا ہورہی ہو، اور یہ سب کچھ دیکھ کر بھی ان کے دلوں میں نہ کوئی بے چینی پیدا ہو، نہ اس حالت کو بدلنے کے لیے کوئی جذبہ بھڑکے بلکہ اس کے برعکس وہ اپنے نفس کو اور عام مسلمانوں کو غیر اسلامی نظام کے غلبے پر اصولاً و عملاً مطمئن کردیں، ان کا شمار آخر کار محسنین میں کس طرح ہوسکتا ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور اس جرم عظیم کے ساتھ محض یہ بات انھیں احسان کے مقام عالی پر کیسے سرفراز کر سکتی ہے کہ وہ چاشت اور اشراق اور تہجد کے نوافل پڑھتے رہے۔ ذکر و شغل اور مراقبے کرتے رہے، حدیث و قرآن کے درس دیتے رہے، جزئیات فقہ کی پابندی اور چھوٹی چھوٹی سنتوں کے اتباع کا سخت اہتمام فرماتے رہے اور تزکیۂ نفس کی خانقاہوں میں دینداری کا وہ فن سکھاتے رہے جس میں حدیث و فقہ اور تصوف کی باریکیاں تو ساری موجود تھیں مگر ایک نہ تھی تو وہ حقیقی دینداری جو "سر داد نداد دست در دست یزید" کی کیفیت پیدا کرے اور "بازی اگرچہ پا نہ سکا سر تو کھو سکا" کے مقام وفاداری پر پہنچائے۔ آپ دنیوی ریاستوں اور قوموں میں بھی وفادار اور غیر وفادار کی اتنی تمیز ضرور نمایاں پائیں گے کہ اگر ملک میں بغاوت ہو جائے یا ملک کے کسی حصے پر دشمن کا قبضہ ہو جائے تو باغیوں اور دشمنوں کے تسلط کو جو لوگ جائز تسلیم کر لیں، یا ان کے تسلط پر راضی ہو جائیں اور ان کے ساتھ مغلوبانہ مصالحت کر لیں، یا ان کی سرپرستی میں کوئی ایسا نظام بنائیں جس میں اصلی اقتدار کی باگیں انہی کے ہاتھ میں رہیں اور کچھ ضمنی حقوق و اختیارات انھیں بھی مل جائیں، تو ایسے لوگوں کو کوئی ریاست اور کوئی قوم اپنا وفادار ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتی خواہ وہ قومی فیشن کے کیسے ہی سخت پابند اور جزئی معاملات میں قومی قانون کے کتنے ہی شدید پیرو ہوں۔ آج آپ کے سامنے زندہ مثالیں موجود ہیں کہ جو ملک جرمنی کے تسلط سے نکلے ہیں وہاں ان لوگوں کے ساتھ کیا معاملہ ہو رہا ہے جنھوں نے جرمن قبضے کے زمانے میں تعاون و مصالحت کی راہیں اختیار کی تھیں۔ ان سب ریاستوں اور قوموں کے پاس وفاداری کو جانچنے کا ایک ہی معیار ہے اور وہ یہ کہ کسی شخص نے دشمن کے تسلط کی مزاحمت کس حد تک کی، اس کو مٹانے کے لیے کیا کام کیا اور اس اقتدار کو واپس لانے کی کیا کوشش کی جس کی وفاداری کا وہ مدعی تھا۔ پھر کیا معاذ اللہ خدا کے متعلق آپ کا یہ گمان ہے کہ وہ اپنے وفاداروں کو پہچاننے کی اتنی تمیز بھی نہیں رکھتا جتنی دنیا کے ان کم عقل انسانوں میں پائی جاتی ہے؟ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ وہ بس داڑھیوں کا طول، ٹخنوں اور پائنچوں کا فاصلہ، تسبیحوں کی گردش، اوراد و وظائف اور نوافل اور مراقبے کے مشاغل اور ایسی ہی چند اور چیزیں دیکھ کر ہی دھوکا کھا جائیگا کہ آپ اس کے سچے وفادار و جاں نثار ہیں؟

حضرات! اب میں ایک آخری بات کہہ کر اپنی تقریر ختم کروں گا۔ عام مسلمانوں کے ذہن پر مدتوں کے غلط تصورات کی وجہ سے جزئیات و ظواہر کی اہمیت کچھ اس طرح چھا گئی ہے کہ دین کے اصول و کلیات اور دینداری و اخلاقِ اسلامی کے حقیقی جوہر کی طرف خواہ کتنی ہی توجہ دلائی جائے، مگر لوگوں کے دماغ پھر پھر کر انہی چھوٹے چھوٹے مسائل اور وزادی ظاہری چیزوں میں اٹک کر رہ جاتے ہیں جنھیں اصل دین بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ اس وبائے عام کے اثرات خود ہمارے بہت سے رفقا، اور ہمدردوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ میں اپنا پورا زور یہ سمجھانے میں صرف کر رہا ہوں کہ دین کی حقیقت کیا ہے، اس میں اصل اہمیت کن چیزوں کی ہے، اور اس میں مقدم کیا ہے اور موخر کیا۔ لیکن ان ساری کوششوں کے بعد جب دیکھتا ہوں یہی دیکھتا ہوں کہ وہی ظاہر پرستی اور وہی اصول سے بڑھ کر فروع کی اہمیت دماغوں پر مسلط ہے۔ آج تین روز سے میرے پاس پرچوں کی بھرمار ہو رہی ہے جن میں سارا مطالبہ بس اس کا ہے کہ جماعت کے لوگوں کی داڑھیاں بڑھوائی جائیں، پائنچے ٹخنوں سے اونچے کرائے جائیں، اور ایسے ہی دوسرے جزئیات کا اہتمام کرایا جائے۔ اس کے علاوہ بعض لوگوں کے اس خیال کا بھی مجھے علم ہوا کہ انھیں جماعت میں اس چیز کی بڑی کمی محسوس ہوتی ہے جس کو وہ "روحانیت" سے تعبیر کرتے ہیں مگر شاید خود نہیں بتا سکتے کہ وہ فی الواقع ہے کیا شے۔ اس بنا پر ان کی رائے یہ ہے کہ نصب العین اور طریق کار تو اس جماعت کا اختیار کیا جائے اور تزکیۂ نفس و تربیت روحانی کے لیے خانقاہوں کا طرف

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رجوع کیا جائے۔ یہ ساری باتیں صاف بتاتی ہیں کہ ابھی تک ہماری تمام کوششوں کے باوجود لوگوں میں دین کا فہم پیدا نہیں ہوا ہے۔ میں ابھی آپ کے سامنے ایمان، اسلام، تقویٰ اور احسان کی جو تشریح عرض کر چکا ہوں اس میں اگر کوئی چیز قرآن وحدیث کی تعلیم سے تجاوز کر کے میں نے خود وضع کر دی ہو تو آپ بے تکلف اس کی نشاندہی فرما دیں۔ لیکن اگر آپ تسلیم کرتے ہیں کہ کتاب اللہ وسنت رسول اللہ کی رو سے یہی ان چاروں چیزوں کی حقیقت ہے تو پھر خود ہی سوچیے کہ جہاں ایمان کے مقتضیات بھی پوری طرح متحقق نہ ہوں اور جہاں تقویٰ اور احسان کی جڑ ہی نہ پائی جاتی ہو وہاں آخر کون سی روحانیت پائی جا سکتی ہے جسے آپ تلاش کرنے جا رہے ہیں۔ رہے وہ جزئیات شرع جن کو آپ نے دین کے اولین مطالبات میں شمار کر رکھا ہے، تو ان کا حقیقی مقام میں آپ کے سامنے پھر ایک مرتبہ صاف صاف واضح کیے دیتا ہوں تاکہ میں اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو جاؤں۔

سب سے پہلے ٹھنڈے دل سے اس بات پر غور کیجیے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول دنیا میں کس غرض کے لیے بھیجے ہیں۔ دنیا میں آخر کس چیز کی کمی تھی، کیا خرابی پائی جاتی تھی، جسے رفع کرنے کے لیے انبیاء کو مبعوث کرنے کی ضرورت پیش آئی؟ کیا وہ یہ تھی کہ لوگ داڑھیاں نہ رکھتے تھے اور انھیں رکھوانے کے لیے رسول بھیجے گئے؟ یا یہ کہ لوگ ٹخنے ڈھانکے رہتے تھے اور انبیاء کے ذریعہ سے انھیں کھلوانا مقصود تھا؟ یا وہ سنتیں، جن کے اہتمام کا آپ لوگوں میں بہت چرچا ہے، دنیا میں جاری نہ تھیں اور انہی کو جاری کرنے کے لیے انبیاء کی ضرورت تھی؟ ان سوالات پر آپ غور کریں گے تو خود ہی کہہ دیں گے کہ نہ اصل خرابیاں یہ تھیں اور نہ انبیاء کی بعثت کا اصل مقصود یہ تھا۔ پھر سوال یہ ہے کہ وہ اصلی خرابیاں کیا تھیں جنھیں دور کرنا مطلوب تھا اور وہ حقیقی بھلائیاں کیا تھیں جنھیں قائم کرنے کی ضرورت تھی؟ اس کا جواب آپ اس کے سوا اور کیا دے سکتے ہیں کہ خدا کی اطاعت و بندگی سے انحراف، خود ساختہ اصول وقوانین کی پیروی، اور خدا کے سامنے ذمہ داری وجوابدہی کا عدم احساس، وہ اصل خرابیاں تھیں جو دنیا میں رونما ہو گئی تھیں۔ اُنہی کی بدولت اخلاقِ فاسدہ پیدا ہوئے، غلط اصولِ زندگی رائج ہوئے اور زمین میں فساد برپا ہوا۔ پھر انبیاء علیہم السلام اس غرض کے لیے بھیجے گئے کہ انسانوں میں خدا کی بندگی و وفاداری اور اس کے سامنے جوابدہی کا احساس پیدا کیا جائے، اخلاقِ فاضلہ کو نشو و نما دیا جائے اور انسانی زندگی کا نظام ان اصولوں پر قائم کیا جائے جن سے خیر وصلاح ابھرے اور شر و فساد دبے۔ یہی ایک مقصد تمام انبیاء کی بعثت کا تھا اور آخر کار اسی مقصد کے لیے محمد صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے۔

اب دیکھیے کہ اس مقصد کی تکمیل کے لیے محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے کس ترتیب و تدریج کے ساتھ کام کیا۔ سب سے پہلے آپ نے ایمان کی دعوت دی اور اس کو وسیع ترین بنیادوں پر پختہ و مستحکم فرمایا۔ پھر اس ایمان کے مقتضیات کے مطابق بتدریج اپنی تعلیم و تربیت کے ذریعہ سے اہل ایمان میں عملی اطاعت و فرمانبرداری (یعنی اسلام)، اخلاقی طہارت (یعنی تقویٰ)، اور خدا کی گہری محبت و وفاداری (یعنی احسان) کے اوصاف پیدا کیے۔ پھر ان مخلص مومنوں کی منظم سعی و جہد سے قدیم جاہلیت کے فاسد نظام کو ہٹانا اور اس کی جگہ قانونِ خداوندی کے اخلاقی و تمدنی اصولوں پر ایک نظامِ صالح قائم کرنا شروع کر دیا۔ اس طرح جب یہ لوگ اپنے دل و دماغ، نفس و اخلاق، افکار و اعمال، جملہ حیثیات سے واقعی مسلم، متقی اور محسن بن گئے اور اس کام میں لگ گئے جو اللہ تعالیٰ کے وفاداروں کو کرنا چاہیے تھا، تب آپ نے ان کو بتانا شروع کیا کہ وضع قطع، لباس، کھانے پینے، رہنے سہنے، اٹھنے بیٹھنے اور دوسرے ظاہری برتاؤ میں وہ مہذب آداب و اطوار کون سے ہیں جو متقیوں کو زیب دیتے ہیں۔ گویا پہلے مسِ خام

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کو کندن بنایا پھر اس پر اشرفی کا ٹھپہ لگایا۔ پہلے سپاہی تیار کیا پھر اسے وردی پہنائی۔ یہی اس کام کی صحیح ترتیب ہے جو قرآن و حدیث کے غائر مطالعہ سے صاف نظر آتی ہے۔ اگر اتباع سنت نام ہے اس طرزِ عمل کا جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی مرضی پوری کرنے کے لیے ہدایت الٰہی کے تحت اختیار کیا تھا، تو یقیناً یہ سنت کی پیروی نہیں بلکہ اس کی خلاف ورزی ہے کہ حقیقی مومن، مسلم، متقی اور محسن بنے بغیر اپنے آپ کو تقویٰ کے ظاہری سانچے میں ڈھالا جائے اور محسنوں کے سے چند مشہور و مقبولِ عام افعال کی نقل اتاری جائے۔ یہ پیسے اور تانبے کے ٹکڑوں پر اشرفی کا ٹھپہ لگا کر بازار میں ان کو چلانا اور سپاہیت، وفاداری اور جاں نثاری پیدا کیے بغیر نرے وردی پوش نمائشی سپاہیوں کو میدان میں لا کھڑا کرنا، میرے نزدیک تو ایک کھلی ہوئی جعل سازی ہے، اور اسی جعل سازی کا نتیجہ ہے کہ نہ بازار میں آپ کی ان جعلی اشرفیوں کی کوئی قیمت اٹھتی ہے اور نہ میدان میں آپ کے ان نمائشی سپاہیوں کی بھیڑ سے کوئی معرکہ سر ہوتا ہے۔

پھر آپ کیا سمجھتے ہیں کہ خدا کے ہاں اصلی قدر کس چیز کی ہے۔ فرض کیجیے کہ ایک شخص سچا ایمان رکھتا ہے، فرض شناس ہے، اخلاقِ صالحہ سے متصف ہے، حدود اللہ کا پابند ہے اور خدا کی وفاداری و جاں نثاری کا حق ادا کر دیتا ہے، مگر ظاہری فیشن کے اعتبار سے ناقص اور ظاہری تہذیب کے معیار سے گرا ہوا ہے۔ اس کی حیثیت زیادہ سے زیادہ بس یہی تو ہوگی کہ ایک اچھا ملازم ہے، مگر ذرا بدتمیز ہے۔ ممکن ہے اس بدتمیزی کی وجہ سے اس کو مراتب عالیہ نصیب نہ ہو سکیں، مگر کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اس قصور میں اس کی وفاداری کا اجر بھی مارا جائے گا اور اس کا مالک صرف اس لیے اسے جہنم میں جھونک دے گا کہ وہ خوش وضع اور خوش اطوار نہ تھا؟ فرض کیجیے کہ ایک دوسرا شخص ہے جو بہترین شرعی فیشن میں رہتا ہے اور آدابِ تہذیب کے التزام میں کمال درجہ محتاط ہے، مگر اس کی وفاداری میں نقص ہے، اس کی فرض شناسی میں کمی ہے، اس کی غیرتِ ایمانی میں خامی ہے۔ آپ کیا اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس نقص کے ساتھ اس ظاہری کمال کی حد سے حد کتنی قدر خدا کے ہاں ہوگی؟ یہ مسئلہ تو کوئی گہرا اور پیچیدہ قانونی مسئلہ نہیں ہے جسے سمجھنے کے لیے کتابیں کھنگالنے کی ضرورت ہو۔ محض عقلِ عام سے ہی ہر آدمی جان سکتا ہے کہ ان دونوں چیزوں میں سے اصلی قدر کی مستحق کونسی چیز ہے۔ دنیا کے کم عقل لوگ بھی اتنی تمیز ضرور رکھتے ہیں کہ حقیقت میں قابلِ قدر شے کیا ہے۔ یہ انگریزی حکومت آپ کے سامنے موجود ہے۔ یہ لوگ جیسے کچھ فیشن پرست ہیں، اور ظاہری آداب و اطوار پر جس طرح جان دیتے ہیں اس کا حال آپ کو معلوم ہے۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ ان کے ہاں اصلی قدر کس چیز کی ہے؟ جو فوجی افسران کی سلطنت کا جھنڈا بلند کرنے میں اپنے دل و دماغ اور جسم و جان کی ساری قوتیں صرف کر دے اور فیصلے کے وقت پر کوئی قربانی دینے میں دریغ نہ کرے وہ خواہ ان کے نقطۂ نظر سے کتنا ہی اجڈ اور گنوار ہو، کئی کئی دن شیو نہ کرتا ہو، بے ڈھنگا لباس پہنتا ہو، کھانے پینے کی ذرا تمیز نہ رکھتا ہو، رقص کے فن سے نابلد ہو، مگر ان سارے عیوب کے باوجود وہ اس کو سر آنکھوں پر بٹھائیں گے اور اسے ترقی کے بلند ترین مرتبے دیں گے۔ بخلاف اس کے جو شخص فیشن، تہذیب، خوش تمیزی اور سوسائٹی کے مقبولِ عام اطوار کا معیاری مجسمہ ہو لیکن وفاداری و جاں نثاری میں ناقص ہو اور کام کے وقت پر فرض اور تقاضائے غیرتِ قومی کے مقابلہ میں اپنی جان، اپنی راحت اور اپنے مصالح کا زیادہ لحاظ کر جائے اسے وہ کوئی عزت کا مقام دینا تو درکنار شاید اس کا کورٹ مارشل کرنے میں بھی دریغ نہ کریں۔ یہ جب دنیا کے کم عقل انسانوں کی معرفت کا حال ہے تو اپنے خدا کے متعلق آپ کا کیا گمان ہے؟ کیا وہ سونے اور تانبے میں تمیز کرنے کے بجائے محض زرد پر اشرفی کا ٹھپہ دیکھ کر اشرفی کی قیمت اور پیسے کا ٹھپہ دیکھ کر پیسے کی قیمت لگا دے گا؟

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میری اس گزارش کو یہ معنی نہ پہنائیے کہ میں ظاہری محاسن کی نفی کرنا چاہتا ہوں، یا ان احکام کی تعمیل کو غیر ضروری قرار دے رہا ہوں جو زندگی کے ظاہری پہلوؤں کی اصلاح و درستی کے متعلق دیے گئے ہیں۔ درحقیقت میں تو اس کا قائل ہوں کہ بندۂ مومن کو ہر اس حکم کی تعمیل کرنی چاہیے جو خدا اور رسول نے دیا ہو، اور یہ بھی مانتا ہوں کہ دین انسان کے باطن اور ظاہر دونوں کو درست کرنا چاہتا ہے۔ لیکن جو چیز میں آپ کے ذہن نشین کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ مقدم چیز باطن ہے نہ کہ ظاہر۔ پہلے باطن میں حقیقت کا جوہر پیدا کرنے کی فکر کیجیے، پھر ظاہر کو حقیقت کے مطابق ڈھالیے۔ آپ کو سب سے بڑھ کر اور سب سے پہلے ان اوصاف کی طرف توجہ کرنی چاہیے جو اللہ کے ہاں اصلی قدر کے مستحق ہیں اور جنھیں نشو و نما دینا انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا اصلی مقصود تھا۔ ظاہر کی آراستگی اول تو ان اوصاف کے نتیجے میں نظرۃً خود ہی ہوتی چلی جائے گی اور اگر اس میں کچھ کسر رہ جائے تو تکمیل مراحل میں اس کا اہتمام بھی کیا جا سکتا ہے۔

دوستو اور رفیقو! میں نے بیماری کے اور کمزوری کے باوجود آج یہ طویل تقریر آپ کے سامنے صرف اس لیے کی ہے کہ میں امر حق کو پوری وضاحت کے ساتھ آپ تک پہنچا کر خدا کے حضور بری الذمہ ہونا چاہتا ہوں۔ زندگی کا کوئی اعتبار نہیں۔ کوئی نہیں جانتا کہ کب اس کی مہلت عمر ان پوری ہو۔ اس لیے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ حق پہنچانے کی جو ذمہ داری مجھ پر عائد ہوتی ہے اس سے سبکدوش ہو جاؤں۔ اگر کوئی امر وضاحت طلب ہو پوچھ لیجیے، اگر میں نے کوئی بات خلاف حق بیان کی ہو تو اس کی تردید کیجیے، اور اگر میں نے ٹھیک ٹھیک حق آپ تک پہنچا دیا ہے تو اس کی گواہی دیجیے۔ (آوازیں: ہم گواہ ہیں)۔ آپ بھی گواہ رہیں اور خدا بھی گواہ ہو۔ میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ مجھے اور آپ سب کو اپنے دین کا صحیح فہم بخشے اور اس فہم کے مطابق دین کے سارے تقاضے اور مطالبے پورے کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

اس کے بعد جلسہ برخواست ہوا اور اجتماع کی کارروائی بھی ختم ہو گئی۔

دیگر اداروں کی مطبوعات جو ہمارے یہاں ملتی ہیں

حقیقت شرک ۔ مولانا سندھی اور ان کے افکار و خیالات پر ایک نظر۔ ذہنی زلزلے۔ تفسیر سورۂ قیامہ (از مولانا حمید الدین فراہی) سورۂ لہب ۔ سورۂ مرسلات ۔ سورۂ والتین ۔ سورۂ والشمس ۔ سورۂ عبس ۔ اقسام القرآن ۔ اسلام اور اشتراکیت (از مولانا مسعود عالم صاحب ندوی)۔ اسلامی نظام (از حکیم محمد اسحاق صاحب سندیلوی)۔ اسلام کا نظریۂ سیاسی اور فلاح عالم (از حکیم محمد اسحاق صاحب)۔ علماء اور اسلام (از مولوی مظہر الدین صاحب صدیقی)۔ مسلمان کیا کریں ۔ مسلمان کی پہچان ۔ اسلام کا استغاثہ

ہماری زیر طبع مطبوعات

مسئلۂ جبر و قدر ۔ بن حق ۔ دینیات ۔ تفہیمات ۔ خطبات ۔ مذہب کا انقلابی تصور

ملنے کا پتہ:

مکتبہ جماعت اسلامی ۔ دار الاسلام ۔ پٹھان کوٹ

(پنجاب)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مقالات

عبادت اور عبودیت

(۴)

از افادات امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ

(ترجمہ مولوی صدر الدین صاحب اصلاحی)

اس توضیح کے بعد یہ بات بآسانی سمجھ میں آجاتی ہے کہ قلب انسانی کے اندر اللہ تعالیٰ کی محبت جتنی زیادہ ہوتی جائے گی اتنی ہی اس کی عبودیت بھی بڑھتی جائے گی اور وہ ماسوا سے اسی قدر آزاد اور بے نیاز ہوتا چلا جائے گا۔ علیٰ ہذا القیاس جس قدر اس میں عبدیت کا رنگ گہرا ہوتا جائے گا اتنا ہی اللہ کے عشق اور غیر اللہ سے بے نیازی کا نقش پائیدار ہوتا جائے گا۔

قلب انسانی کی خصوصیت انسان فطرۃً اللہ تعالیٰ کی احتیاج محسوس کرتا ہے۔ ایسی احتیاج جس میں عجز اور تذلل کا عنصر بھی شامل ہے۔ اس احتیاج کی دو جہتیں ہیں۔ ایک تو جہت عبادت جس کو علت غائی کہنا چاہیے۔ دوسری جہت استعانت و توکل، جس کو علت فاعلی کہنا چاہیے۔ پس قلب انسانی اللہ کی عبادت، محبت اور اس کی طرف انابت کے بغیر نہ تو کبھی حقیقی صلاح و فلاح حاصل کر سکتا ہے، اور نہ ہی کچی لذت اور سرور کی دولت سے بہرہ ور ہو سکتا ہے اور نہ سکون خالص اور اطمینان صادق کی نعمت سے لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ اس کو دنیا کی ساری نعمتیں اور لذتیں میسر کیوں نہ آجائیں لیکن پھر بھی اضطراب کی خلش اس کی گہرائیوں میں موجود ہی رہے گی اور حقیقی سکون و اطمینان کی لذت سے محروم ہی رہے گا، کیونکہ اس کے اندر محبوب حقیقی کی ایک فطری پیاس موجود ہے اور وہ اپنے اندر اپنے پروردگار کی ایک ذاتی احتیاج اور فطری طلب رکھتا ہے۔ اس لیے کہ فی الواقع وہی اس کا اصلی معبود اور محبوب ہے اور اسی کو پاکر وہ صحیح معنوں میں سکون و طمانیت اور لذت و سرور کی شادکامیوں سے متمتع ہو سکتا ہے۔ اور یہ چیز اس کو حاصل ہو نہیں سکتی جب تک اللہ تعالیٰ ہی اس کی دستگیری نہ کرے۔ اس کے ماسوا اس پوری کائنات میں کوئی نہیں جو اس کے کام آسکے۔ پس انسان کا قلب دائمی طور پر اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کی روح اور اس کی حقیقت کا فطرۃً محتاج ہے۔ اس لیے اگر اس کے اس محبوب اور مقصود حقیقی کے حصول میں اس کی اعانت کر بھی دی جائے لیکن عبادت الٰہی کا ایسا سچا ذوق اس میں موجود نہ ہو کہ وہی اس کی طلب و جستجو کا مرکز و منتہا قرار پا چکا ہو اور اول و آخر اسی کی محبت اس کا سرمایۂ زندگی بن چکی ہو اور اس کے علاوہ جس کسی سے بھی وہ محبت کرتا ہو، اصالۃً نہ کرتا ہو بلکہ خدا ہی کے لیے کرتا ہو، تو اس کیفیت کے ہوتے ہوئے بھی وہ نہ تو لا الٰہ الا اللہ کا رمز شناس ہو سکتا نہ توحید، عبدیت اور محبت الٰہی کے ذروۂ کمال تک اس کی رسائی ہو سکتی ہے۔ اس حالت میں نہ صرف اس میں ایک نقص اور عیب موجود ہو گا بلکہ ہر وقت وہ ایک قسم کی بے چینی اور حسرت اور اندرونی خلش محسوس کرتا رہے گا۔

اسی طرح اگر وہ خدا کو اپنا مطلوب حقیقی تو سمجھتا ہو اور اس کے حاصل کرنے کے لیے ریاضتیں بھی کرتا ہو مگر اس سعی و جستجو میں تو خدا ہی سے توفیق طلبی کرتا ہو نہ اس مقصد کے حصول میں اس کی اعانتوں کا خود کو حاجتمند سمجھتا ہو اور نہ اس سلسلہ میں تنہا وہی اس کی امیدوں کا ملجا و ماویٰ ہو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تو کبھی بھی گوہر مقصود ہے اس کا دامن بھر نہیں سکتا، کیونکہ کسی چیز کا وجود و عدم خدا ہی کی مشیت کے تابع ہے۔

پس انسان دو حیثیتوں سے اللہ جل شانہٗ کا محتاج ٹھیرا، ایک تو یہ کہ وہی اس کا تنہا اور حقیقی مطلوب اور محبوب و معبود ہے۔ دوسری یہ کہ تنہا وہی اس کا چارہ ساز، پشت پناہ، دست گیر، مرکز، مآل اور مرجع اعتماد ہے۔ یعنی وہی اس کا "الٰہ" ہے جس کے سوا کوئی اس کا معبود نہیں، اور پھر وہی اس کا "رب" ہے جس کے سوا کوئی اس کا مالک و آقا نہیں۔ اور عبودیت انسان کی کامل نہیں ہو سکتی جب تک کہ یہ دونوں چیزیں موجود نہ ہوں۔ ورنہ اگر کوئی شخص کسی بھی غیر اللہ کی محبت بالذات کرتا ہے یا اس سے اعانت کی امیدیں وابستہ رکھتا ہے تو دراصل وہ اس محبت و امید کی مقدار کے مطابق اسی کا بندہ ہے۔ بخلاف اس کے اگر غیر اللہ سے اس کی محبت بالذات نہ ہو بلکہ خدا ہی کے لیے ہو، نیز خدا کے سوا کبھی کسی سے کوئی امید نہ باندھتا ہو اور جن اسباب و ذرائع سے اپنے مقاصد کے حصول میں کام لیتا ہو یا مقاصد کو حاصل کرتا ہو ان کے متعلق پورے شرح صدر کے ساتھ یہ یقین رکھتا ہو کہ اللہ تعالیٰ ہی ہے جس نے ان اسباب کو پیدا اور مقدر کیا ہے، بجائے خود یہ کوئی قدرت اور تاثیر نہیں رکھتے، نہ کسی اور کے اختیار پر یہ معرض وجود میں آئے ہیں، بلکہ اس زمین کی سطح سے لے کر آسمان کی بلندیوں تک جتنی مخلوقات ہیں سب کا پروردگار، مالک، آقا اور سب کا خالق اللہ ہی ہے اور سب اسی کی بہمہ وجوہ محتاج ہیں ——— اگر انسان ان صفات سے آراستہ ہے تو سمجھنا چاہیے کہ وہ اپنی قسمت کے مطابق کمال عبودیت سے سرفراز ہے۔ اور اس سعادت کے حصول میں لوگوں کے درجے اس قدر مختلف ہیں کہ ان کا صحیح اندازہ اور شمار اللہ ہی کو معلوم ہے اور تمام مخلوق میں فضل و کمال، عظمت و مکرمت اور ہدایت و تقرب الٰہی کے لحاظ سے وہی شخص اعلیٰ و افضل ہے جس کی عبدیت مذکورہ بالا وجوہ سے اعلیٰ و اکمل ہو۔

اسلام کی حقیقت | یہی ہے اس دین کی حقیقت جسے اسلام کہا جاتا ہے اور جس کی تعلیم و تبلیغ کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء کو مبعوث فرمایا اور اپنی کتابیں نازل کیں۔ یعنی یہ کہ بندہ اپنے آپ کو ہر حیثیت سے خدا ہی کا تابع فرمان بنا دے اور ذرہ برابر بھی کسی غیر کا فرماں بردار نہ رہے۔ ایسا شخص جو خدا کو بھی اطاعت کا مستحق سمجھتا ہے اور ساتھ ہی کسی دوسرے کو بھی، وہ مشرک ہے، اسی طرح اس کے برعکس جو خدائی اطاعت و انقیاد کو سرے سے تسلیم ہی نہیں کرتا وہ مستکبر ہے۔

کبر اور عبدیت میں منافات | اور کبر کے بارے میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"یقین رکھو کہ جنت میں وہ شخص داخل نہیں ہو سکتا جس کے دل میں ذرہ بھر بھی غرور ہو گا۔ بالکل اسی طرح جس طرح دوزخ میں وہ شخص نہیں جا سکتا جس کے اندر ذرہ برابر بھی ایمان ہو گا۔" (صحیح بخاری)

گویا معلوم ایمان کے نزدیک غرور اور ایمان ایک دوسرے کی ضد ہیں، کیونکہ غرور عبودیت کی حقیقت کے بالکل منافی ہے جیسا کہ حدیث قدسی کے الفاظ بتلاتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ عظمت میری "ازار" ہے اور کبریائی میری "ردا" ہے۔ پس جو شخص ان دونوں میں سے کوئی چیز بھی مجھ سے چھیننے کی کوشش کرے گا میں اس کو سخت سزا دوں گا۔" (صحیح بخاری)

معلوم ہوا کہ عظمت اور کبریائی ربوبیت کے خصائص میں سے ہیں، کسی مخلوق کو ان صفات جلالی میں سے کوئی حصہ بھی نہیں ملا ہے۔ لیکن ان دونوں میں بھی کبریائی کا مقام عظمت سے اونچا ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اسے بمنزلہ ردا قرار دیا ہے، اور عظمت کو بمنزلہ ازار کہا ہے۔ ردا، ازار سے بلند مقام پر ہوتی ہے، یہی راز ہے کہ اذان، نماز اور عیدین کا شعار "اللہ اکبر" ٹھیرایا گیا ہے اور یہ کلمہ مسلمان کے لیے پستی ... قرار دیا گیا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کر سبب بلند مقامات پر مثلاً صفا و مروہ پر ہو یا کسی اونچائی پر چڑھ رہا ہو یا کسی جانور پر سوار ہو، یا ہو تو تکبیر کہے اور اللہ جل شانہ کی کبریائی کا اعلان کرے۔ اس تکبیر کا یہ اعجاز ہے کہ اس سے بھڑکتی ہوئی آگ کے بلند سے بلند شعلے سرد پڑ جاتے ہیں اور شیطان اس کو سننے کی تاب نہیں لا سکتا۔ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے کہ:

اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ؕ اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ سَیَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِیْنَ۔	مجھے پکارو میں تمہاری التجائیں سنوں گا۔ یقیناً جو لوگ میری بندگی سے منہ موڑتے ہیں وہ عنقریب ذلت کے عالم میں داخل جہنم ہوں گے۔

کبر مستلزم شرک ہے

ہر وہ شخص جو خدا کی بندگی سے استکبار کرتا ہے، ضروری ہے کہ وہ کسی نہ کسی غیر اللہ کی بندگی کا قلادہ اپنی گردن میں ڈالے ہوئے ہو گا۔ کیونکہ انسان کوئی بےحس اور جامد شے نہیں ہے بلکہ وہ فطرتاً ایک حساس اور متحرک ہستی ہے۔ صحیح حدیث میں ہے کہ حارث اور ہمام سب سے زیادہ سچے اور ثابت الوجود اسماء یعنی صفات انسانی ہیں۔ "حارث" کے معنی ہیں کمانے والا اور حرکت و عمل کرنے والا۔ اور "ہمام" کے معنی ہیں ارادہ کرنے والا۔ پس ارادہ انسان کی ایک ذاتی صفت ہے جس سے وہ کبھی خالی نہیں ہو سکتا۔ پھر ہر ارادہ کا ایک منتہٰی اور مقصود پایا جانا بھی ضروری ہے۔ ان دونوں مقدموں کو تسلیم کرنے کے بعد اس امر واقعی سے انکار کی گنجائش نہیں رہ جاتی کہ ہر انسان کا ایک محبوب و مقصود ہونا چاہیے جو اس کی محبتوں کا محور اور ارادوں کا مرکز ہو۔ پس جس شخص کا معبود و محبوب اللہ تعالیٰ نہ ہو وہ خدا کی محبت اور نیازمندی سے اپنے کو برتر اور بےنیاز سمجھتا ہو، لازماً کوئی نہ کوئی غیر اللہ اس کا مراد اور محبوب ضرور ہو گا جو اس کو اپنا غلام اور بندہ بنائے ہوئے ہو گا، خواہ وہ مال و زر ہو یا شان و شوکت ہو یا حسن و جمال ہو، یا خدا کے سوا اس کا خود ساختہ کوئی معبود ہو، مثلاً چاند، سورج، ستارے، مورتیاں، انبیاء و صلحاء کی قبریں وغیرہ یا کوئی نبی یا فرشتہ یا کوئی اور شے جس کا وہ خدا کو چھوڑ کر پجاری ہو۔ اور جب وہ کسی غیر اللہ کا پرستار بن گیا تو پھر اس کے مشرک ہونے میں کوئی کسر رہ گئی۔ معلوم ہوا کہ جو متکبر ہو گا مشرک ضرور ہو گا۔

فرعون کی مثال

چنانچہ فرعون کی مثال اس حقیقت کی ایک زندہ شہادت ہے، جو دنیا کا عظیم ترین مستکبر گزرا ہے لیکن ساتھ ہی مشرک بھی تھا۔ پہلی چیز یعنی اس کے استکبار کا ذکر متعدد آیات میں بالتفصیل موجود ہے:

وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُوْنِیْٓ اَقْتُلْ مُوْسٰى وَلْیَدْعُ رَبَّهٗ ۚ ...... وَقَالَ مُوْسٰٓى اِنِّیْ عُذْتُ بِرَبِّیْ وَرَبِّكُمْ مِّنْ كُلِّ مُتَكَبِّرٍ لَّا یُؤْمِنُ بِیَوْمِ الْحِسَابِ ..... كَذٰلِكَ یَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ	اور فرعون نے کہا مجھے موسیٰ کو قتل کرنے دو اور پکارا کرے وہ اپنے رب کو بلائے .... اور موسیٰ نے کہا کہ میں نے اس متکبر سے، جو حساب کے دن پر ایمان نہیں رکھتا، اپنے اور تمہارے رب کی پناہ مانگتا ہوں ..... اسی طرح اللہ تعالیٰ ہر سخت گیر متکبر کے دل پر مہر کر دیا کرتا ہے۔
وَقَارُوْنَ وَفِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ ۟ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مُّوْسٰى بِالْبَیِّنٰتِ فَاسْتَكْبَرُوْا فِی الْاَرْضِ وَمَا كَانُوْا سٰبِقِیْنَ۔	اور قارون اور فرعون اور ہامان (جن کے پاس موسیٰ روشن دلائل لیکر آئے لیکن انھوں نے خدا کے ماننے اور اس کی بندگی سے انکار کر دیا اور) دنیا میں کبر و غرور کی روش اختیار کی، حالانکہ وہ ہم سے بچ نکلنے والے نہ تھے۔
فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ اٰیٰتُنَا مُبْصِرَةً قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ ۚ وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَیْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا ؕ فَانْظُرْ كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِیْنَ۔	جب ان کے پاس ہماری نشانیاں بالکل کھلے طور پر آئیں تو انھوں نے کہا یہ تو صریح جادو ہے اور ان کو ماننے سے انھوں نے ظلم اور سرکشی کی بنا پر انکار کر دیا۔ حالانکہ ان کے دل ان کی صداقت پر یقین رکھتے تھے سو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دیکھو کہ ان فسادیوں کا انجام کیسا ہوا؟۔

دوسری چیز پر یعنی یہ کہ فرعون مشرک تھا، یہ آیت گواہ ہے :۔

وَقَالَ الْمَلَأُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ أَتَذَرُ مُوسٰى وَقَوْمَهٗ لِيُفْسِدُوْا فِي الْأَرْضِ وَيَذَرَكَ وَاٰلِهَتَكَ۔

اور فرعون کی قوم میں سے بڑے لوگوں نے فرعون سے کہا کہ آپ موسیٰ اور اس کی قوم کو یوں ہی چھوڑے رہیں گے تاکہ وہ ملک میں فساد انگیزی کریں اور آپ کو اور آپ کے معبودوں کو چھوڑ دیں؟

اور نہ صرف یہ کہ ہر مستکبر مشرک ہوتا ہے بلکہ استقرار اور تجربہ بتلاتا ہے کہ جو شخص خدا کی بندگی اور اطاعت سے جتنا ہی زیادہ سرکشی کرتا ہے اتنا ہی زیادہ وہ بڑا مشرک ہوتا ہے، کیونکہ عبادت الٰہی سے وہ جس قدر زیادہ سرتابی کرتا ہے گا اسی قدر اپنے کسی نہ کسی ایسے مراد و محبوب کا زیادہ محتاج اور نیازکیش ہوتا جائے گا جو اس کے دل و دماغ کا مقصود اوّل اور مطلوب حقیقی ہوگا اور اس طرح وہ اپنے اس لات و منات کا اسی مناسبت سے بندہ بن جائے گا۔ کیونکہ یہ چیز انسان کی جبلت کے خلاف ہے کہ اس کا دل ایسا کوئی نہ کوئی مقصود و مطلوب نہ رکھتا ہو، اس لیے جب اصل مقصود یعنی اللہ تعالیٰ کو اس نے اپنے قلب سے نکال پھینکا تو ضرور ہے کہ کوئی دوسری شے اس خالی جگہ پر قبضہ کر لے، ورنہ تمام مخلوقات سے قلب انسانی کا خالی اور بے نیاز ہونا اس وقت تک ناممکن ہے جب تک کہ اللہ تعالیٰ ہی اس کا آقا و مولیٰ نہ بن جائے ــــ ایسا آقا اور مولیٰ جس کے سوا وہ کسی کی عبادت نہ کرے، کسی سے مدد نہ مانگے، کسی پر توکل نہ کرے اور صرف اسی چیز سے خوش رہے جو خدا کو محبوب ہو اور اسی شے کو بری سمجھے جو خدا کے نزدیک مکروہ و مبغوض ہو، خدا کے دوستوں کو اپنا دوست سمجھے اور اس کے دشمنوں کو اپنا دشمن قرار دے، اسی کے لیے محبت کرے اور اسی کے لیے نفرت۔ اسی صفت باطنی کا نام اخلاص دین ہے، یہ اخلاص جتنا زیادہ عمیق اور استوار ہوگا خدا کی عبدیت اتنی ہی زیادہ کامل، اور ماسوا کی بے نیازی اسی قدر مکمل ہوگی، اور عبدیت کا حصول کمال ہی کبر اور شرک کا واحد علاج ہے۔

یہود و نصاریٰ کی اصلی گمراہیاں | یہی دونوں بیماریاں ہیں جو اہل کتاب میں پیدا ہوگئی تھیں۔ نصاریٰ پر شرک غالب تھا اور یہودیوں پر کبر۔ جیسا کہ قرآن کریم کا ارشاد ہے۔ نصاریٰ کے متعلق فرمایا کہ :۔

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ۔

ان لوگوں نے اپنے علماء اور مشائخ کو اللہ کے سوا اپنا رب بنالیا ہے۔ خصوصاً مسیح ابن مریم کو۔ حالانکہ انہیں صرف یہ حکم دیا گیا تھا کہ ایک معبود کی عبادت کریں جس کے سوا کوئی دوسرا معبود ہے ہی نہیں، پاک و برتر ہے اللہ اس چیز سے جس کو یہ خدا کا شریک ٹھہراتے ہیں۔

یہود کے بارے میں فرمایا کہ :۔

اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ۔

تو کیا جب کبھی کوئی رسول تمہاری خواہشوں کے خلاف کوئی پیغام لے کر آئے گا تو تم خودسری کرو گے، چنانچہ ان میں سے کچھ کو تم نے جھٹلا دیا اور کچھ

سَاَصْرِفُ عَنْ اٰيٰتِيَ الَّذِيْنَ يَتَكَبَّرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَاِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الرُّشْدِ لَا يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الْغَيِّ يَتَّخِذُوْهُ

میں اپنی آیتوں (پر ایمان لانے) سے ان لوگوں کو دور ہی رکھوں گا جو زمین میں بغیر کسی استحقاق کے بڑے بنتے ہیں۔ اور اگر یہ لوگ ہر ایک نشانی دیکھ لیں جب بھی ان پر ایمان نہ لائیں گے، اور اگر ہدایت کا راستہ دیکھتے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سَبِيلًا۔ ہیں تو اسکو اپنا راستہ نہیں بناتے لیکن اگر گمراہی کی راہ دیکھ پائیں تو اُس پر چل پڑتے ہیں۔

ہر نبی کا دین اسلام تھا چونکہ کبر شرک کو مستلزم ہے اور شرک اسلام کی ضد اور گناہ عظیم ہے جس کی معافی کا بارگاہ احدیت میں حسب اعلانِ قرآنی، کوئی امکان نہیں، اس لیے ابتدائے آفرینش سے آج تک جتنے انبیاء آئے، سب اسی دین "اسلام" کو لے کر آئے، اس لیے تنہا یہی وہ دین ہے جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول ہے۔ نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو مخاطب کرکے فرمایا:-

فَإِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَمَا سَأَلْتُكُمْ مِنْ أَجْرٍ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى اللَّهِ وَأُمِرْتُ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْمُسْلِمِينَ۔

اگر تم میری بات ماننے سے انکار کرتے ہو تو جائے تعجب ہے، اس میں میرا کوئی نقصان نہیں کیونکہ) میں تم سے کسی اجر کا طالب نہیں، میرا اجر تو اللہ کے ذمہ ہے اور مجھے حکم ہے کہ میں "اسلام" لانے والوں میں سے بنوں۔

ابراہیم علیہ السلام کی دعوت وارشاد اور طرزِ عمل کے متعلق قرآن میں ہے کہ:-

إِذْ قَالَ لَهُ رَبُّهُ أَسْلِمْ قَالَ أَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ۔ وَوَصَّىٰ بِهَا إِبْرَاهِيمُ بَنِيهِ وَيَعْقُوبُ يَا بَنِيَّ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰ لَكُمُ الدِّينَ فَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ۔

جب اس کے پروردگار نے اس سے کہا "مسلم" (اطاعت گزار) بن جا تو اس نے جواب دیا کہ میں نے پروردگار کائنات کے لیے اپنی گردن جھکا دی اور پھر اسی امر کی اس نے اپنے بیٹوں اور یعقوب کو وصیت کی کہ اے میرے بیٹو! اللہ نے تمہارے لیے اس دین کو پسند فرمایا ہے سو تم مرتے دم تک مسلم (اللہ کے اطاعت گزار) رہنا۔

یوسف علیہ السلام فرماتے ہیں:-

تَوَفَّنِي مُسْلِمًا وَأَلْحِقْنِي بِالصَّالِحِينَ۔

خدایا! مجھے دنیا سے مسلم اٹھا اور نیکوکاروں کے زمرہ میں داخل کر۔

موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم سے خطاب کرتے ہیں:-

يَا قَوْمِ إِنْ كُنْتُمْ آمَنْتُمْ بِاللَّهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوا إِنْ كُنْتُمْ مُسْلِمِينَ۔

اے میری قوم کے لوگو! اگر تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو تو اسی پر بھروسہ کرو اگر تم مسلم ہو۔

توراۃ کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تمام انبیاء بنی اسرائیل، جو توراۃ کی شریعت کے مبلغ اور پیرو تھے، ان کا دین یہی اسلام تھا۔ إِنَّا أَنْزَلْنَا التَّوْرَاةَ فِيهَا هُدًى وَنُورٌ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّونَ الَّذِينَ أَسْلَمُوا لِلَّذِينَ هَادُوا۔

بلقیس کے سامنے جب صداقت کی تجلی چمکی تو پکار اٹھی:-

رَبِّ إِنِّي ظَلَمْتُ نَفْسِي وَأَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمَانَ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ۔

مالک! یقیناً میں نے اب تک اپنے اوپر بڑا ہی ظلم کیا، اور اب سلیمان کے ساتھ تمام جہانوں کے پروردگار اللہ کی "مسلم" بنتی ہوں۔

حواریین عیسیٰ کے متعلق اللہ تعالیٰ کہتا ہے:-

وَإِذْ أَوْحَيْتُ إِلَى الْحَوَارِيِّينَ أَنْ آمِنُوا بِي وَبِرَسُولِي قَالُوا آمَنَّا وَاشْهَدْ بِأَنَّنَا مُسْلِمُونَ۔

اور جب میں نے حواریوں کو وحی کی کہ مجھ پر اور میرے رسول پر ایمان لاؤ تو انھوں نے جواب دیا ہم ایمان لائے اور اے خدا تو گواہ رہ کہ ہم "مسلم" ہیں۔

قرآن حکیم کی ان تصریحات سے یہ حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ ہر پیغمبر کا دین اسلام تھا۔ یہی وجہ ہے کہ خداوند تعالیٰ کا یہ اعلان ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کہ اسلام کی شاہراہ ہی وہ تنہا شاہراہ ہے جو ہیری بارگاہ قبولیت تک پہنچاتی ہے۔

إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ۔ — بے شک دین تو اللہ کے نزدیک صرف اسلام ہے۔

وَمَن يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَن يُقْبَلَ مِنْهُ — اور جس شخص نے اسلام کے سوا کوئی دوسرا دین اختیار کیا اس کا دین ہرگز قبول نہ کیا جائے گا۔

اسلام دینِ کائنات ہے نہ صرف یہ کہ ہر نبی اسلام لے کر آیا اور تمام بنی آدم کا یہی دین رہا ہے بلکہ اسلام ساری کائنات کا دین ہے۔ قرآن کہتا ہے:-

أَفَغَيْرَ دِينِ اللَّهِ يَبْغُونَ وَلَهُ أَسْلَمَ مَن فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا۔ — کیا یہ لوگ اللہ کے دین کو چھوڑ کر کوئی اور دین چاہتے ہیں، حالانکہ آسمانوں اور زمین میں جو کوئی بھی ہے، چار و ناچار اسی کے سامنے سرنگندہ ہے۔

"طَوْعًا وَكَرْهًا" کی قید کل کائنات کے اسلام میں اس وجہ سے لگائی ہے کہ تمام مخلوقات اللہ تعالیٰ کی مکمل تابع اور زیر فرمان ہیں خواہ کوئی اس فرماں برداری کا اقرار کرے یا نہ کرے، نیز تمام لوگ اس کے سامنے عاجز محض ہیں اور اس کے دست تصرف و تدبیر میں ہیں، اس کے فرامین مشیت اور احکام تدبیر سے ایک سر مو انحراف کسی کے لیے ممکن ہی نہیں، اس لیے چار و ناچار سب ہی اس کے مسلم اور مطیع و منقاد ہیں، ساری طاقتوں اور قدرتوں کا سرچشمہ اسی کی ذات ہے، ایک ذرہ سے لے کر آفتاب تک ہر چھوٹی بڑی چیز کا پروردگار وہی ہے، جس طرح چاہتا ہے ان میں بلا روک ٹوک تصرف کرتا رہتا ہے، سب کا پیدا کرنے والا، سب کو وجود بخشنے والا اور سب کی صورتیں بنانے والا وہی ہے۔ اس جہانِ ہستی میں اس کے سوا جو کچھ ہے سب کا سب مخلوق ہے، مربوب ہے، محتاج ہے، فقیر ہے، غلام ہے، مجبور ہے، مقہور ہے اور ہر حیثیت سے مسخر ہے۔ اللہ ہی اکیلا ہر شے کا خالق اور مصور ہے۔ اگرچہ جس چیز کو بھی اس نے پیدا کیا ہے، اسباب کے ساتھ پیدا کیا ہے لیکن ان اسباب کا خالق اور صاحب تقدیر بھی وہی ہے، اس لیے وہ اسباب بھی اسی طرح اس کے محتاج ہیں۔ اور اس عالم کون و فساد میں کوئی سبب بھی اپنی تاثیر میں مستقل بالذات نہیں ہے بلکہ ہر سبب ایک دوسرے سبب کا دست نگر رہتا ہے جس کی اعانت کے بغیر وہ اپنا عمل اور اثر ظاہر نہیں کر سکتا۔ یہ سبب یعنی علت، العلل ذات باری تعالیٰ ہے جو اسباب و علل سے مافوق اور ہر شے سے بے نیاز ہے جس کا نہ تو کوئی شریک ہے کہ اس کی اعانت کرے، نہ کوئی مقابل ہے جو میدان مقابلہ میں اس کے سامنے آئے۔

قُلْ أَفَرَأَيْتُم مَّا تَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ إِنْ أَرَادَنِيَ اللَّهُ بِضُرٍّ هَلْ هُنَّ كَاشِفَاتُ ضُرِّهِ أَوْ أَرَادَنِي بِرَحْمَةٍ هَلْ هُنَّ مُمْسِكَاتُ رَحْمَتِهِ قُلْ حَسْبِيَ اللَّهُ، عَلَيْهِ يَتَوَكَّلُ الْمُتَوَكِّلُونَ۔ — اے نبی! ان سے کہو کہ کیا تم نے ان کے حال پر کچھ غور کیا جن کو خدا کو چھوڑ کر تم پوجتے ہو؟ اگر اللہ مجھے کوئی نقصان پہنچانا چاہے تو کیا یہ اس کے نقصان کو دور کر سکتی ہیں؟ یا اگر خدا مجھ پر کوئی رحمت کرنی چاہے تو کیا یہ اس کی رحمت کو روک سکتی ہیں؟ کہہ دو کہ اللہ میرے لیے کافی ہے۔ اسی پر بھروسہ رکھنے والوں کو بھروسہ رکھنا چاہیے۔

اس طرح کی بے شمار آیتیں قرآن میں موجود ہیں جو شہادت دیتی ہیں کہ ہر فعل اور ہر سبب فعل کی باگ ڈور مشیت الٰہی کے ہاتھوں میں ہے۔ حضرت ابراہیم خلیل نے اپنی قوم کی کٹ حجتیوں اور دھمکیوں کے جواب میں اسی حقیقت کو یہاں کو پیش فرمایا تھا کہ "میں تمہارے شریک ٹھیرائے ہوئے معبودانِ باطل سے ڈرنے والا نہیں۔ ہاں اگر میرے پروردگار ہی کی مشیت کچھ اس قسم کی ہو تو اور بات ہے"۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ابراہیم خلیل عبدیتِ کاملہ کا نمونہ | عبدیت کے سلسلہ میں حضرت ابراہیم ایک امتیازی شان اور اسوۂ کمال رکھتے ہیں۔ خدا کی ساری زمین دینِ شرک کی ظلمتوں سے تاریک ہو رہی تھی کہ توحید، عبودیت اور اخلاص کا یہ نورانی پیکر حق پرستوں اور مخلصوں کا امام بن کر نمودار ہوا جس کی عبدیت کاملہ کا خود معبود کو اعتراف ہے:۔

وَاِذِ ابْتَلٰۤى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ قَالَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ ؕ قَالَ لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ ۔

اور جب ابراہیم کو اس کے رب نے چند باتوں میں آزمایا اور اس نے ان کو پورا کر دیا تو پروردگار نے فرمایا کہ میں تجھ کو لوگوں کا پیشوا بناؤں گا۔ ابراہیم نے کہا اور میری اولاد میں سے؟ جواب ملا کہ میرا وعدہ ظالموں کے لیے نہیں۔

دیکھو یہاں بھی اللہ تعالیٰ نے غیر مبہم طریقہ پر اس امر کی تصریح کر دی ہے کہ یہ وعدۂ امامت صرف مومنوں اور حدودِ عبدیت کی حفاظت کرنے والوں کے لیے ہے۔ ظالموں اور حدودِ الٰہی سے تجاوز کرنے والوں کے لیے نہیں ہے، اور سب سے بڑا ظلم شرک ہے۔ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ۔ پس ظالموں اور مشرکوں کو یہ رتبہ حاصل نہیں ہو سکتا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے قوموں کی امامت کے منصب پر سرفراز کیے جائیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو امامتِ اقوام کا شرف کمالِ عبودیت کی آزمائش میں کامیاب ثابت ہونے پر ملا تھا۔ چنانچہ آپ کو خدا پرستی کا اسوہ اور پیشوا قرار دیا گیا اور آپ کی نسل کو اللہ تعالیٰ نے نبوت کی نعمتِ عظمیٰ سے نوازا، اور آپ کے بعد جو نبی بھی مبعوث ہوا آپ ہی کی ملت پر مبعوث ہوا۔ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا۔ (اے نبی یکسو ہو کر ملتِ ابراہیمی کی پیروی کر)۔ دوسری جگہ یہود و نصاریٰ کی نسبت فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت کو یہودیت و نصرانیت کی گروہ بندی سے کوئی علاقہ نہیں، اللہ تعالیٰ کی ہدایت تو ملتِ ابراہیمی کی پیروی میں ہے۔ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِیْفًا۔

حدیث میں حضرت ابراہیم کی شان میں فرمایا گیا ہے کہ "ابراہیم خیر البریہ ہیں"۔ معلوم ہوا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ تمام مخلوق اور سارے انبیاء سے افضل ہیں، چنانچہ دربارِ خداوندی سے آپ کو "خلیل اللہ" کا خطاب عطا ہوا ہے جس سے بڑا کوئی عزت کا خطاب کسی کو نہیں ملا۔

خلت کا مفہوم | اس امر کی دلیل کہ "خلیل" سے بڑھ کر کوئی خطاب نہیں، خود "خلیل" اور "خلت" کے الفاظ کی تہوں میں پوشیدہ ہے۔ "خلت" نام ہے بندہ کی خدا کے ساتھ انتہائی محبت کا، جو کمالِ عبودیت کو مستلزم ہو نیز بندہ کے ساتھ خدا کی اس کامل محبت کا جو بندے کے لیے اس کی کامل ربوبیت کو لازم ہو۔ اور لفظ "عبودیت" جیسا کہ آغازِ بحث میں تفصیل کے ساتھ بتلایا جا چکا ہے، انتہائی تذلل اور انتہائی محبت کے مجموعہ کا نام ہے۔ پس مقامِ خلت، محبت کے مقام سے بلند تر ہوا۔ اور یہی وہ اعلیٰ کمال ہے جو حضرت ابراہیم اور حضرت محمد علیہما السلام کو اللہ تعالیٰ کے دربار سے مرحمت ہوا تھا اور یہی وجہ ہے کہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اس زمین پر بسنے والوں میں سے کوئی خلیل نہ تھا، جیسا کہ آپ نے فرمایا ہے کہ "اگر میں اہلِ ارض میں سے کسی کو اپنا خلیل منتخب کرتا تو وہ ابوبکر ہوتے لیکن میں تو اللہ تعالیٰ کا خلیل ہو چکا ہوں"۔ معلوم ہوا کہ انسان کسی ایک ہی کا خلیل بن سکتا ہے اور خلت قابلِ شرکت چیز نہیں۔ خلت کے مفہوم کو کسی نکتہ داں شاعر نے کس خوبی کے ساتھ واضح کیا ہے:۔

قد تخللت مسلک الروح مني وبذا سمي الخليل خليلا

(اے میرے محبوب میری روح کے ایک ایک ریشہ میں تو "متخلل پذیر" ہو گیا ہے (یعنی چھا گیا ہے)، اسی وجہ سے خلیل کو خلیل کہتے ہیں۔)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

محبت اور خلت میں فرق محبت اور خلت میں یہی فرق و امتیاز ہے کہ خلت شرکت غیر کی متحمل اور روادار نہیں لیکن محبت میں یہ بات نہیں پائی جاتی۔ خلت صرف ایک سے ہو سکتی ہے اور محبت ایک کے سوا دوسروں سے بھی ہو سکتی ہے۔ چنانچہ رسول اکرم صلعم نے اللہ تعالےٰ سے رشتۂ خلت رکھنے کے باعث، کسی ماسوا کو اپنا خلیل بنانے سے انکار فرمایا، مگر اللہ تعالےٰ سے محبت رکھنے کے باوجود بہت سے لوگوں کو اپنا حبیب قرار دیا۔ مثلاً حضرت حسینؓ اور حضرت اسامہؓ کے متعلق فرمایا کہ "خدایا! میں ان سے محبت رکھتا ہوں سو تو بھی ان سے محبت رکھ۔" اسی طرح عورتوں میں سے حضرت عائشہؓ کو اور مردوں میں سے حضرت ابوبکرؓ کو آپؐ نے اپنا سب سے بڑھ کر محبوب قرار دیا۔ کلام رسول کے بعد کلام الٰہی پر نظر ڈالیے تو جگہ جگہ دکھائی پڑتا ہے کہ "اللہ متقیوں سے محبت کرتا ہے"، "اللہ محسنوں سے محبت رکھتا ہے"، "اللہ توبہ کرنے والوں سے محبت رکھتا ہے" "اللہ ایسے لوگوں کو لائے گا جن کو وہ محبوب رکھتا ہوگا اور جو اس کو محبوب رکھتے ہوں گے"۔ گویا اللہ تعالیٰ بتانا چاہتا ہے کہ سچے مومن وہ ہوتے ہیں جن سے خدا محبت رکھتا ہے اور جو خدا سے محبت رکھتے ہیں۔ دوسری جگہ فرمایا "ایمان والے سب سے زیادہ خدا سے محبت رکھنے والے ہوتے ہیں"۔ جس سے ثابت ہوا کہ مومن صالح اگرچہ سب سے زیادہ خدا ہی سے محبت رکھتا ہے مگر دوسروں سے بھی محبت رکھ سکتا ہے جس کا لازمی اور منطقی نتیجہ یہ نکلا کہ محبت میں وحدت ضروری نہیں، بخلاف خلت کے۔

ایک خیال عام کی تردید عام طور پر یہ خیال پھیلا ہوا ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے حبیب تھے اور حضرت ابراہیم اللہ کے خلیل تھے، اور یہ کہ محبت کا مقام خلت کے مقام سے مافوق ہے۔ لیکن یہ خیال کوئی مضبوط بنیاد نہیں رکھتا۔ کیونکہ احادیث صحیحہ سے یہ اچھی طرح ثابت ہے کہ آنحضرت بھی خلیل اللہ تھے۔ صحیح بخاری اور مسلم دونوں میں یہ روایت موجود ہے اور مختلف طرق و اسانید کے ساتھ موجود ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

"یہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ کو اپنا خلیل بنایا ہے جیسا کہ ابراہیم کو اپنا خلیل بنایا تھا۔

ایک دوسری حدیث اوپر گذر چکی ہے جس میں آپ نے فرمایا ہے کہ میں اللہ کا خلیل ہو چکا ہوں اور اب کسی اور کو خلیل بنانے کا موقع و محل باقی نہیں رہا۔

لذت اور حلاوت ایمانی ہم پہلے بیان کر آئے ہیں کہ محبت الٰہی سے مراد یہ ہے کہ ان چیزوں سے محبت کی جائے جو اللہ تعالیٰ کو محبوب ہیں۔ محبت الٰہی کی یہ تاویل ہم نے نصوص شرعیہ کی روشنی میں کی ہے۔ اس سلسلہ میں صحیحین کی مذکورہ بالا حدیث کے پر حکمت الفاظ پر دوبارہ غور کیجیے جس میں فرمایا گیا ہے کہ "تین چیزیں ہیں کہ جس کسی کے اندر یہ تینوں موجود ہوں گی وہی حلاوت ایمانی سے شاد کام ہوگا ... الخ"۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی چیز سے لذت یابی، اس کی محبت کے بعد ہوتی ہے۔ یعنی اگر ایک شخص کسی چیز کی محبت و آرزو رکھتا ہے تو جس وقت وہ چیز اس کو حاصل ہوتی ہے وہ ایک کیفیت، ایک حلاوت، ایک لذت اور ایک سرور محسوس کرتا ہے۔ اور لذت اس خاص کیفیت کا نام ہے جو کسی موافق طبع شے یعنی کسی مرغوب و محبوب شے کے ادراک اور حصول کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ اور بعض خام کار فلسفیوں اور طبیبوں کا یہ خیال کہ لذت شے مرغوب کے نفس ادراک و حصول ہی کا نام ہے، ایسا پھُسپھُسا اور بے اصل ہے کہ جس کی تردید کی بھی ضرورت نہیں۔ کیونکہ "یہ ادراک اور حصول" تو رغبت اور لذت کی بیچ کی کڑی ہے نہ کہ نفس لذت۔ مثال کے طور پر کھانے کا مسئلہ لیجیے۔ کھانا انسان کی ایک مرغوب چیز ہے اور جب وہ اس کھانے کو کھا لیتا ہے تو ایک لذت محسوس کرتا ہے۔ پھر یہ کہنا کس قدر غلط ہے کہ کھانا کھانا ہی لذت ہے۔ اسی طرح قوت باصرہ کو لیجیے، جب انسان کسی محبوب شے کی طرف دیکھتا ہے تو دیکھنے کے بعد اس سے لذت پاتا ہے۔ معلوم ہوا کہ لذت کا حصول دیکھنے اور نظر ڈالنے کے بعد ہوتا ہے اس لیے نظر اور چیز ہوئی اور لذت اور چیز جو نظر کے بعد وجود میں آتی ہے۔ قرآن کے الفاظ بھی اسی حقیقت کی شہادت دیتے ہیں:-

© rasailojaraid.com

وَفِیْهَا مَا تَشْتَهِیْهِ الْاَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْاَعْیُنُ
اور اس بہشت میں وہ نعمتیں ہیں جن کی دلوں کو آرزو ہوگی اور جن سے آنکھیں لذت گیر ہوں گی۔

معلوم ہوا کہ نفس نظر اور رویت کا نام لذت نہیں ہے ورنہ یوں نہ فرمایا جاتا کہ "آنکھیں ان کو دیکھ کر لذت گیر ہوں گی"۔

یہی حال تمام احساسات نفس کا ہے، نفس کو جو خوشی یا غم وغیرہ کیفیات لذت والم محسوس ہوتی ہیں وہ کسی نہ کسی شے محبوب یا امر مکروہ کے شعور وادراک کا نتیجہ ہوتی ہیں نہ کہ نفس شعور وادراک۔ پس ایمان کی حلاوت اور پھر اس کے ساتھ لذت وسرور کا حصول خدا کے ساتھ کامل محبت کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ اور یہ مقام تین چیزوں میں پورا اترنے کے بعد ہاتھ آتا ہے۔ ایک تو اس محبت کی تکمیل، دوسری اس محبت کی تفریع، تیسری اس محبت کی ضد سے نفرت اور مدافعت۔ تکمیل محبت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ اور رسول ساری موجودات سے زیادہ محبوب ہوں، کیونکہ جیسا کہ پہلے گذر چکا، اللہ اور اس کے رسول کی محبت کے باب میں صرف اتنی بات کافی نہیں ہے کہ نفی اجمالی سے محبت رکھی جائے بلکہ یہ ضروری ہے کہ ان کی محبت سب سے زیادہ ہو۔ اور تفریع محبت کا مدعا یہ ہے کہ اگر بندہ کسی انسان کی محبت کرے تو وہ محبت بھی للہ ہو، بالاصل نہ ہو۔ اور دفع ضد کا مفہوم یہ ہے کہ ضد ایمان ــــ کفر و شرک ــــ کو آگ میں پڑنے سے بڑھ کر ناپسندیدہ کر سمجھے۔

جب یہ بات معلوم ہو گئی کہ رسول خدا اور مومنوں کی محبت بھی دراصل خدا کی محبت ہے یعنی اسی کا ایک جزیا پرتو ہے اور رسول خدا صلعم ان مومنوں سے محبت رکھتے تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی محبت کے انعام سے سرفراز کیا تھا، اور اسی وجہ سے رسول کو ان سے محبت تھی کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ سے سب سے زیادہ محبت تھی اس لیے لازماً اللہ کے محبوبوں کی محبت اور اس کے مبغوضوں کا بغض بھی آپ کے قلب مبارک میں سب سے زیادہ ہونا ہی چاہیے تھا۔ لیکن محبت کے بالمقابل خلت کا حال دیکھیے کہ کس طرح اس میں غیر اللہ کے لیے ایک شمہ بھی حصہ نہیں نہ اصالتاً نہ تبعاً، بلکہ وہ اللہ ہی کے لیے مخصوص ہے۔ جس سے محبت مطلق پر خلت کی فضیلت روز روشن کی طرح عیاں ہوتی ہے۔

محبت الٰہی کے مفہوم میں افراط وتفریط

خلاصہ کلام یہ کہ خدا کی محبت اور خلت ہی میں عبودیت الٰہی کی حقیقت پوشیدہ ہے۔ لیکن کتنے ہی اہل علم ونظر ایسے ہیں جو اس حقیقت سے دور جا پڑے۔ ان کا گمان ہے کہ عبودیت تو صرف تذلل اور خضوع کا ایک خشک وظیفہ ہے، اس میں محبت کی چاشنی کہاں؟ محبت تو ایک کی قلبی تمناؤں کی انبساطی کیفیت کا اور دوسرے کی طرف سے ناز وانداز کے پیہم جواب کا نام ہے، اور ربوبیت اس قسم کی چیزوں سے ماوراء ہے، پھر یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ایک محبوب یا محب کی حیثیت دی جائے؟ یہی وجہ ہے کہ جب حضرت ذوالنون مصری کے سامنے محبت الٰہی کا ذکر چھیڑا گیا تو آپ نے فرمایا کہ "خاموش رہو، اس مسئلہ پر گفتگو مت کیا کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ عام لوگوں کے کانوں تک یہ بات پہنچے اور وہ محبت الٰہی کا ادعا کرنے لگیں"۔ چنانچہ بعض علما نے ایسے لوگوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا مکروہ قرار دیا ہے جو اللہ تعالیٰ کی خشیت کا ذکر وتصور کیے بغیر صرف اس کی محبت کی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ اس معاملہ میں ایک بزرگ کا قول لوح دل پر آب زر سے لکھنے کے قابل ہے جنھوں نے فرمایا کہ جو شخص خدا کی عبادت صرف محبت کے ساتھ کرتا ہے وہ زندیق ہے اور جو صرف رجا کے ساتھ کرتا ہے وہ مرجی ہے اور جو صرف خوف کے ساتھ کرتا ہے وہ حروری ہے۔ مومن موحد وہ ہے جس نے خدا کی عبادت، محبت، خوف اور رجا تینوں کے ساتھ کی۔ واقعات اس حکیمانہ نکتہ کی گواہی دے رہے ہیں۔ صوفیائے متاخرین میں ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جنھوں نے ادعائے محبت میں حدود کو فراموش کر دیا، آپے سے باہر نکل گئے یہاں تک کہ ان میں ایک طرح کی رعونت پیدا ہو گئی اور وہ ایسے دعوے

© rasailojaraid.com

کرنے لگے جو عبدیت کے منافی ہیں اور جن میں ایسی شان پرورد گارانہ پائی جاتی ہے جو اللہ جل مجدہٗ کے سوا کسی کے شایان شان نہیں انہوں نے اپنے کو اس مقام پر ظاہر کیا جو نبوت و رسالت کے مقام سے بھی بالاتر ہے اور اپنے لیے خدا سے ایسی صفات کا مطالبہ کر گئے جو خدا ہی کے لیے مخصوص ہیں، اور جو انبیاء و رسل کے لیے بھی موزوں نہیں۔

یہ وہ خطرناک غلطی ہے جس کے شیطانی جال نے بڑے بڑے شیوخ طریقت کو شکار کر لیا۔ اس کا سبب عبودیت کی حقیقت تک فہم کی نارسائی اور تحقیق عبادت کی کمی ہے۔ بلکہ در اصل یوں کہنا چاہیے کہ اس کا باعث اس عقل کی کوتاہی ہے جس کے بغیر ایک بندہ اپنی حقیقت پہچان نہیں سکتا۔ پس جب عقل خام کار ہوتی ہے، اور دین کا علم پوری طرح حاصل نہیں رہتا، تو ایسی حالت میں اگر نفس میں محبت کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں تو نفس اپنی نادانی کے باعث اپنے آپ سے باہر ہو جاتا ہے، اس کو اپنی حدود یاد نہیں رہتیں، جیسا کہ عشق مجازی میں اس انسانی فطرت کا مشاہدہ ہم جب چاہیں کر سکتے ہیں۔ پھر جب نفس اس فریب شیطانی کا شکار ہو جاتا ہے تو اس کی زبان سے ایسے بول نکلنے لگتے ہیں، وہ علانیہ کہنے لگتا ہے کہ میں تو عاشق خدا ہوں، میں جو چاہوں کروں مجھ پر کوئی گرفت نہیں۔ یہ کھلی ہوئی گمراہی ہے اور بالکل وہی بات ہے جو یہود اور نصاریٰ کی زبانوں سے نکلی تھی کہ "ہم تو خدا کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں"۔ ان کا جواب خدا نے یہ دیا کہ تم اس کے بیٹے اور پیارے ہونے کا دعویٰ تو کرتے ہو مگر یہ تو بتاؤ کہ وہ تمہیں عذاب پر عذاب کیوں دیا کرتا ہے؟ کیا ابنیت اور محبوبیت کی یہی علامتیں ہیں؟ پس یہ نفس کا ایک خطرناک فریب ہے۔ در حقیقت بندہ جب اللہ کا محبوب ہوتا ہے اس کو وہ صرف ایسے ہی کاموں میں لگاتا ہے جو اس کی رضا کے موجب ہوں، وہ کبھی ایسے کام نہیں کرتا جو اس کی ناراضی کا سبب بنیں۔ اور جو بیباکی اور بیحجابی کرتا ہے اور نافرمانیوں پر نافرمانیاں کرتا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے ان افعال بد کو اسی طرح نفرت اور غضب کی نگاہ سے دیکھتا ہے جس طرح اس کے اعمال نیک کو قدر و محبت کی نظر سے، کیونکہ خدا کسی بندے سے اتنی ہی محبت کرتا ہے جتنا کہ اس میں ایمان اور تقویٰ ہے۔

ایسے شخص کی مثال، جو گمان کرتا ہے کہ محبوب خدا ہونے کے باعث اس کو گناہ کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے، اس کج فہم کی سی ہے جو کہتا ہو کہ چونکہ میرا مزاج معتدل اور میری صحت جسمانی بالکل ٹھیک ہے، اس لیے خواہ میں کتنا ہی زہر کیوں نہ کھاؤں اور بد پرہیزی کیوں نہ کرتا رہوں لیکن اس سے میرا کچھ نہیں بگڑ سکتا۔ اگر یہ عقل کا دشمن قرآن پر نظر ڈالتا اور انبیاء کے احوال و قصص کو تدبر کی نگاہ سے دیکھتا کہ کس طرح نوع انسانی کے ان سرتاجوں کو بھی کبھی تو بہ و استغفار کی ضرورت پیش آئی تھی اور خدا کے ان محبوب ترین بندوں کو بھی اپنے اپنے حالات کے مطابق، تزکیۂ نفس کی خاطر ابتلاؤں اور مصیبتوں کی چکی سے گزرنا ہی پڑا، تو اسے معلوم ہو جاتا کہ گناہ کے نقصانات اپنی ضرر رسانی میں کتنے مستعد اور اپنی اثر اندازی میں کتنے بے رحم واقع ہوئے ہیں کہ کسی بڑے سے بڑے مقرب بندہ کو بھی نہیں بخشتے۔ پھر یہ بات بھی عین مقتضائے فطرت ہے۔ خود انسان، انسان کے تعلقات میں اس اصول کی کارفرمائی مشاہدہ کی جا سکتی ہے۔ ایک وجود انسانی کا عاشق اگر اپنے محبوب کی مرضی اور مصلحت سے واقف نہ ہو اور اس کے مطابق طریق کار اختیار نہ کرے بلکہ صرف اپنے جذبات عشق کے اشاروں پر رقص کرتا رہے تو یقین اس کا یہ رویہ اپنے محبوب کی نفرت اور ناراضی کا، بلکہ عداوت اور تعذیب تک کا موجب ہو جاتا ہے۔

لیکن بدقسمتی سے کتنے ہی اہل سلوک ایسے گزرے ہیں جو محبت الٰہی کے زعم میں طرح طرح کی خلاف دین باتیں نہ جانے کر گئے۔ کہیں تو حدود اللہ کی پاسداری فراموش کر دی گئی، کہیں حقوق اللہ کو پس پشت ڈال دیا گیا، اور کہیں بے سر و پا اور باطل دعاوی کر دیے گئے۔ کوئی صاحب فرما گئے "تو میرے جس کسی مرید نے ایک شخص کو بھی دوزخ میں جانے دیا، اس سے میں بری ہوں"۔ کسی نے اعلان کیا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کہ "جس کسی مرید نے ایک مومن کو بھی دوزخ میں جانے دیا میں اس سے بیزار ہوں" ایک تیسرے صاحب یہ کہ گئے کہ "قیامت کے دن میرا خیمہ جہنم کے دروازے پر نصب رہے گا تاکہ ایک شخص بھی اس کے اندر داخل نہ ہونے پائے۔" یہ اور اسی طرح کے بے شمار اقوال بعض مشہور و معروف مشائخ کی بابت بیان کیے جاتے ہیں، جو یا تو ان بزرگوں پر بہتان اور افترائے محض ہیں یا اگر انھیں کے اقوال ہیں تو یقیناً وہ سخت غلط ہیں جو ہوش کی باتیں نہیں بلکہ حالت سکر یا غلبہ یا فنا کی باتیں ہیں جس میں انسان ہوش اور تمیز کھو بیٹھتا ہے یا کم از کم اس کی تمیز اتنی کمزور ہوجاتی ہے کہ وہ نہیں جان سکتا کہ میرے منہ سے کیا نکل رہا ہے یہی وجہ ہے کہ ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جنھوں نے حالت خاص کے زائل ہونے اور ہوش و تمیز بجا ہوجانے کے بعد اس قسم کی باتوں سے توبہ و استغفار کیا۔ یہی صورت حال ان صوفیا کے بارے میں بھی پیش آئی ہے جنھوں نے عشقیہ قصائد سننے میں اپنے لیے گنجائش پیدا کی۔

ان لغزشوں کا علاج اور محبت کا معیار۔

عشق و محبت کی راہ کے یہی وہ خطرات اور مزلات تھے جن سے بچانے کے لیے اللہ تعالےٰ نے محبت کی ایک کسوٹی مقرر فرما دی ہے تاکہ ہر مدعی کا دعوائے محبت اس پر پرکھ کر دیکھا جا سکے، فرمایا:۔

اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ — اگر تم واقعی خدا سے محبت رکھنے والے ہو تو میرا اتباع کرو اللہ تم کو محبت کریگا

گویا وہی شخص خدا کی محبت کا سچا دعویدار کہا جا سکتا ہے جو اس کے رسول کے ایک ایک نقش قدم کو اپنا اسوہ بنائے۔ اور یہ حقیقت کسی بحث یا تشریح کی محتاج نہیں کہ رسول کی اطاعت و عبادت ہی تحقیق عبودیت کا دوسرا نام ہے۔ پھر قرآن نے ایک قدم اور آگے بڑھا کر حب الٰہی اور حب رسول کا ایک اور نمایاں معیار مقرر فرما دیا ہے، اور وہ ہے جہاد فی سبیل اللہ۔ جہاد کے معنی ہیں اللہ تعالیٰ کے مامورات سے انتہائی شیفتگی اور اس کے منہیات سے مکمل نفرت۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ان خاص بندوں کا جو اس کے محبوب ہیں اور جن کا وہ محبوب ہے نشان امتیاز یہ قرار دیا ہے کہ:۔

اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔ — وہ مومنوں کے سامنے نہایت فروتن ہوتے ہیں لیکن کافروں کے لیے نہایت سخت۔ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے رہتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اس اُمت کی محبت اور عبودیت امم سابقہ کے مقابلہ میں زیادہ کامل و اکمل ہے۔ اور اس امت کے اندر اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم بہ نسبت اور لوگوں کے زیادہ کامل ہیں یا پھر وہ لوگ جو اصحاب رسول کا سچا نمونہ بن جائیں۔ جو ان سے جتنی ہی زیادہ عملی ہمرنگی پیدا کرے گا اتنا ہی زیادہ کامل العبودیت ہوگا۔

ایک طرف محبتِ الٰہی کا یہ معیار اور نمونۂ عمل سامنے رکھیے، پھر ان لوگوں کے اقوال اور کردار پر نظر ڈالیے جو اپنے کو خدا کی محبت کا اور اس کی محبوبیت کا اجارہ دار سمجھتے ہیں، حالانکہ رسول کی سنت اور اس کی اطاعت کی دن رات دھجیاں اُڑاتے رہتے ہیں اور ایسے عقائد و تصورات رکھتے ہیں جو دین و شریعت کی بنیاد ہی ڈھا دیتے ہیں۔

پس اتباع شریعت اور جہاد فی سبیل اللہ ہی وہ سب سے بڑا فرق و امتیاز ہے جو خدا کے سچے عاشقوں اور غلط کار مدعیوں کے درمیان پایا جاتا ہے جس کے ذریعہ ان اولیاء اللہ کے جو واقعتہً خدا کے محب اور محبوب ہیں، اور ان مدعیانِ محبت کے درمیان تمیز کی جا سکتی ہے جو دعوائے محبت کے ساتھ مخالف شرع امور یعنی اپنی جی کی گھڑی ہوئی بدعات کا اتباع کرتے رہتے ہیں یا محبت کا یہ خود ساختہ مفہوم لیتے ہیں کہ خدا کی پیدا کی ہوئی ہر چیز سے محبت کی جائے حتیٰ کہ کفر و فسق و عصیان جیسی چیزوں سے بھی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ یہی وہ خطرناک غلط فہمی تھی جس نے یہود و نصاریٰ کو ڈبو دیا۔ ان نام نہاد صوفیائے اسلام کا دعوائے محبت بھی انھیں اہل کتاب کے اِدّعائے محبت کی طرح کا ہے جو کہا کرتے تھے کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے لاڈلے ہیں۔ گو اس لحاظ کہ ان کا کفر ان کے کفر کی حد تک نہیں پہنچا ہے، انھیں یہود و نصاریٰ کے برابر گمراہ نہیں کہا جا سکتا لیکن اگر ایک اور پہلو سے دیکھا جائے تو ان کا دعویٰ ان یہودیوں اور نصرانیوں کے دعوے سے بھی بدتر اور مہلک تر ہے کیونکہ اس کے اندر مخالفت شرع کے ساتھ ساتھ نفاق کے جراثیم بھی موجود ہیں اور معلوم ہے کہ منافقین کا مستقر دوزخ کے سب سے نچلے طبقہ میں ہوگا۔

محبت الٰہی کی تعلیم توراۃ اور انجیل میں بھی اسی طرح موجود ہے جس طرح قرآن میں۔ اور ان کتابوں کے الفاظ و عبارات اور اصل تعلیمات کے بارے میں خود ان کے پیروؤں کے درمیان شدید اختلافات ہیں مگر باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ محبت الٰہی کی تعلیم کے اصلی ہونے میں کسی گروہ کو اختلاف نہیں۔ بلکہ یہ تعلیم ان کے ہاں "ناموس" کی سب سے بڑی اور بنیادی وصیت تسلیم کی جاتی ہے۔ انجیل میں ہے کہ حضرت عیسیٰ نے فرمایا، مسیح کی سب سے بڑی وصیت یہ ہے کہ "تو خداوند کی محبت کر اپنے پورے قلب اور اپنی پوری عقل اور اپنی پوری روح کے ساتھ۔" چنانچہ آج بھی نصاریٰ کو اس امر کا دعویٰ ہے کہ وہ اس حب الٰہی پر قائم ہیں۔ اور ان کے اندر جو زہد اور عبادت پائی جاتی ہے وہ اسی وصیت کا اثر ہے۔ لیکن واقعہ کیا ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی محبت سے بالکل تہی دامن ہو چکے ہیں کیونکہ وہ ان چیزوں پر عمل نہیں کرتے جو خدا کو پسند ہیں بلکہ ان چیزوں پر عمل کرتے ہیں جو خدا کو مبغوض ہیں، انھیں رضائے الٰہی کی پرواہی نہیں، جس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ نے ان کے سارے اعمال حبط کر دیے ہیں۔ ادھر وہ محبوبیت کے نشہ میں مست، ادھر اللہ تعالیٰ انھیں اپنے باغیوں اور ملعونوں کی فہرست میں شامل کر چکا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ وہ ان لوگوں کو اپنا محبوب اور مورد لطف و کرم رکھتا ہے جو فی الحقیقت اس کے محب ہوں، پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ بندہ تو خدا سے محبت رکھتا ہو اور خدا کو اس سے کوئی محبت نہ ہو! بلکہ واقعہ یہ ہے کہ خدا سے بندہ کو جتنی محبت ہوتی ہے خدا کو بھی اتنی ہی محبت اس سے ہوتی ہے اور عنایت مزید یہ ہوتی ہے کہ اس کا اجر اس کی بہ نسبت کہیں زیادہ دیتا ہے جیسا کہ حدیث قدسی میں ہے کہ:۔

"جو شخص میری طرف ایک بالشت بڑھتا ہے میں اس کی طرف ایک ہاتھ بڑھتا ہوں اور جو میری طرف ایک ہاتھ قریب آتا ہے میں اس کی طرف ایک گز قریب ہو جاتا ہوں۔ اور جو میری طرف پیدل آتا ہے میں اس کی طرف دوڑ کر آتا ہوں۔"

قرآن کو دیکھیے تو قدم قدم پر یہ الفاظ ملتے ہیں "اللہ متقیوں سے محبت رکھتا ہے"، "اللہ احسان کرنے والوں کو محبوب رکھتا ہے"، "اللہ توبہ کرنے والوں کو پسند کرتا ہے" وغیرہ۔ نہ صرف یہ بلکہ نصوص تو یہ بتاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ انھیں لوگوں کو اپنی محبوبیت کی سند افتخار عطا فرماتا ہے جو واجبات سے گذر کر نوافل پر کثرت سے عمل کرنے لگتے ہیں۔ مشہور حدیث قدسی ہے:۔

"بندہ نوافل کے ذریعہ میرے قریب ہوتا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ میرا محبوب ہو جاتا ہے۔ اس وقت میں ہی اس کے کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے...... الخ"

اہل زہد و ریاضت کی خام خیالیاں۔

اللہ تعالیٰ کی محبوبیت اور محبت کا یہ معیار اسلامی نگاہ میں رکھیے اور اس کے بعد ایسے پر خود غلط زہاد کے مزعومات پر نظر ڈالیے جو زہد و عبادت کی چند مخصوص چیزوں پر تندہی کے ساتھ عمل پیرا رہتے ہیں۔ مگر کتنے ہی امور ایسے ہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جن میں وہ شریعت کی خلاف ورزی کرتے رہتے ہیں۔ اور اللہ کی راہ میں مجاہدہ کرنے کا تصور تک نہیں رکھتے مگر اس کے باوجود ــــ مخالفت شرع اور ترک جہاد کے باوجود ــــ خدا کی محبت کے مدعی ہیں۔ اور بعض ویسی ہی خام خیالیوں میں مبتلا ہیں جس میں نصاریٰ مبتلا تھے۔ یہ لوگ اپنے اس محدود تصور دین کے اثبات میں اسی قسم کی باتوں سے حجت پیش کرتے ہیں جن کی نصاریٰ نے آڑ لی ہے، یعنی یا تو قرآن و حدیث کے متشابہ الفاظ کی حسب خواہش تاویلیں کرتے ہیں، یا پھر ایسے اقوال وحکایات پر اپنے استدلال کی عمارت اٹھاتے ہیں جن کے قائل کی صداقت اور حق پسندی کا ثبوت نہیں اور اگر بربنائے حسن ظن اس کی صداقت شعاری تسلیم ہی کر لی جائے تو بھی اس امر واقعہ سے کون انکار کر سکتا ہے کہ وہ معصوم نہ تھا۔ لیکن اس کے باوجود یہ لوگ اس کی باتوں کو وحی آسمانی کی طرح واجب الاتباع مانتے ہیں جس کا دوسرے لفظوں میں یہ مطلب ہوا کہ جس طرح نصاریٰ نے اپنے علما، اور مشائخ کو شارعین دین کا منصب دے رکھا تھا یہ لوگ بھی اپنے مرشدوں اور پیشواؤں کو در اصل اپنا شارع دین سمجھتے ہیں۔ اور انجام کار نوبت یہاں تک بھی پہنچ جاتی ہے کہ عبودیت کی جڑ پر آرہ چلا دیتے ہیں اور یہ دعویٰ کرنے لگتے ہیں کہ خواص، عبدیت کی حدود پار کر جاتے ہیں، جیسا کہ عیسائی حضرت مسیحؑ کے بارے میں دعویٰ کرتے ہیں۔ حالانکہ دینِ حق تو نام ہے اللہ تعالیٰ کی کامل و مکمل عبدیت کی تحقیق کا اور عبدیت کا ما عبارت ہے اللہ عزوجل کی انتہائی اور ہمہ گیر محبت سے، ایک کی کمی دوسری شئے کی کمی کا ثبوت ہے اور غیر اللہ کی محبت در اصل اس کی عبدیت کا اور غیر اللہ کی عبدیت فی الحقیقت اس کی محبت کا نشان ہے۔ غیر اللہ کی محبت ــــ اگر اللہ ہی کے لیے نہ ہو تو وہ ــــ جبینِ حق کا داغ ہے، اور جس عمل کا ہدف رضائے الٰہی نہ ہو سامانِ حسرت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ ایمان کی نگاہ میں یہ دنیا و مافیہا سب کا سب ملعون ہے سوائے اس کے جو اللہ ہی کے لیے ہو، اور اللہ کے لیے وہی شے ہو سکتی ہے جو اللہ اور اس کے رسول کو پسند ہو اور اللہ اور رسول اللہ کی پسندیدہ چیز وہی ہے جس کی رسول نے اپنے اقوال و افعال کے ذریعہ تعلیم دی ہے۔ پس جو عمل خدا کے لیے نہ ہو وہ بھی مردود (انما الاعمال بالنیات الخ) اور جو عمل اسوۂ رسول کے مطابق نہ ہو وہ بھی مردود (من عمل عملا لیس علیہ امرنا فھو رد)۔

یہی دینِ اسلام کی بنیاد ہے، یہ بنیاد جتنی محکم اور استوار ہوگی اتنی ہی دین کی حقیقت کا وجود ہوگا۔ یہی مقصد تھا آسمانی کتابوں کے نزول کا اور یہی غایت تھی انبیاء کرام کی بعثت کی۔ اسی کا آخری داعیٔ اسلام نے بھی پیغام سنایا، اسی کے لیے اس نے اپنے جسم و روح کی ساری قوتیں وقف کر رکھی تھیں۔

آفاتِ نفس (شرک) اس مقام عبدیت تک پہنچنے میں نفسِ انسانی کی بعض زبردست کمزوریاں روک بن جاتی ہیں، ان میں سے سب سے بڑی اور بنیادی شے میلان شرک ہے۔ شرک نفسِ انسانی کی ایک غالب اور قاہر بیماری ہے، یہاں تک کہ اس امت میں بھی اس کے مخفی جراثیم پائے جاتے ہیں جو توحید کی تنہا علمبردار ہے اور اس کی خبر خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے۔ چنانچہ صحابہ کرام اس سے محفوظ رہنے کی فکر سے کبھی غافل نہیں رہتے تھے۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے پیغمبر صلعم سے پوچھا کہ "جب شرک پائے مور کی آہٹ سے بھی زیادہ مخفی ہوتا ہے (جیسا کہ حضور فرماتے ہیں) تو بھلا ہم اس کے حملہ سے کیونکر بچ سکتے ہیں" ارشاد ہوا کہ "آؤ میں ایک ایسا کلمۂ شفا بتا دوں جو تمہیں ہر چھوٹے بڑے شرک سے محفوظ رکھے گا، تم خدا سے دعا کیا کرو کہ:-

اللھم انی اعوذ بک ان اشرک بک وانا اعلم واستغفرک لما لا اعلم۔	خدایا! میں اس بات سے تیری پناہ مانگتا ہوں کہ جان بوجھ کر تیرا ساجھی ٹھیراؤں اور اس شرک سے تیری مغفرت چاہتا ہوں جس کا مجھے علم نہ ہو"

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حضرت عمرؓ دعا مانگا کرتے تھے کہ :۔

اللھم اجعل عملی کلہ صالحاً واجعلہ لوجھک خالصاً ولا تجعل لاحد فیہ شیئاً۔ اے اللہ میرے ہر عمل کو صالح اور اپنے ہی لیے خالص بنا اور اس میں کسی اور کا کوئی حصہ نہ بنا۔

حب جاہ و مال

نفسیات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ نفسِ انسانی پر ایسی مخفی آرزوئیں چھائی رہتی ہیں جو خدا کی حقیقی محبت و بندگی اور اخلاص کے پودے کو پروان چڑھنے نہیں دیتیں۔ شداد بن اوسؓ نے اہلِ عرب کو مخاطب کرکے فرمایا کہ "اے اہلِ عرب! مجھے تمہارے بارے میں سب سے زیادہ جس چیز کا خوف ہے وہ ریا اور شہوتِ خفیہ (یعنی جاہ و حشمت کی خواہش) ہے۔ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عظیم ترین مہلکۂ ایمانی سے ان لفظوں میں تنبیہ کیا ہے :۔

"دو ایسے بھوکے بھیڑیے، جو بکریوں کے کسی باڑے میں چھوڑ دیے جائیں، ان بکریوں کے لیے اتنے خطرناک نہیں جتنی مال اور جاہ کی حرص، دین و ایمان کے لیے خطرناک ہے۔" (ترمذی)

معلوم ہوا کہ جس سینہ میں سچا اور صحیح دین ہوگا اس میں حرص مال و جاہ کا وجود ممکن نہیں۔ جس کا سبب یہ ہے کہ جب دل محبت اور عبودیتِ الٰہی کا مزا پا لیتا ہے تو پھر اس کی نگاہ میں کوئی شے اس سے بڑھ کر مرغوب نہیں رہ جاتی کہ وہ اس کی طرف مائل ہو سکے۔ یہی وہ چیز ہے جو اہلِ اخلاص کے لیے برائیوں اور بدکاریوں سے محفوظ رہنے کا ذریعہ بنتی ہے، جیسا کہ قرآن کریم سے مترشح ہوتا ہے :۔

كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ ؕ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ۔ اسی طرح، تاکہ ہم یوسف سے برائی اور بے حیائی کو دور رکھیں۔ یقیناً وہ ہمارے مخلص بندوں میں سے تھا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ بندہ مخلص محبتِ الٰہی اور خدا پرستی کا وہ ذوق رکھتا ہے جو اس کو غیر خدا کی محبت اور بندگی سے روک دیتا ہے کیونکہ اس کے دل کے لیے کوئی شے ایمان سے زیادہ شیریں، لذیذ، خوش آیند اور پرکشش نہیں رہ جاتی اور یہ کیفیت باطن تقاضا کرتی ہے کہ قلب اللہ تعالیٰ کی طرف کھنچ اٹھے اور پھر ہمہ دم اسی کی طرف جھکا رہے، اسی کے ذکر میں مشغول ... ی کے خوف سے لرزاں اور اسی کی نوازشوں کا امیدوار رہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا :۔

مَنْ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ وَجَآءَ بِقَلْبٍ مُّنِيْبٍ ۔۔۔۔ الخ۔ جو غیب میں خدائے رحمٰن سے ڈرتا رہا اور اس کے حضور رجوع و انابت سے بھرا ہوا دل لے کر حاضر ہوا ۔۔۔۔ الخ۔

یہ اس لیے کہ محبت کا فطری تقاضا ہی یہ ہے کہ محب اگر ایک طرف وصالِ محبوب کی امیدوں سے سرشار ہوتا ہے تو ساتھ ہی حصولِ مراد کی ناکامیوں کے تصور سے مضطرب بھی رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خدا کا بندہ اور اس کا محب ہمیشہ خوف اور رجاء کے مشترکہ یا منفعل جذبات محسوس کرتا ہے۔ یَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَيَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ کے الفاظ اسی حقیقت کے آئینہ دار ہیں۔

اس کے بالمقابل اس شخص کو لو جو اس دولتِ اخلاص سے بے بہرہ ہے۔ طلب و ارادہ اور محبت مطلق تو بہرحال اس کے دل میں بھی ہوگی کہ طلب و محبت انسانی فطرت کے لوازم میں سے ہے۔ لیکن جس طرح ایک کمزور شاخ ہوا کے ہر اشارے پر جھک جانے کے لیے تیار ہو جاتی ہے، بعینہٖ اسی طرح ایسا آدمی بھی نورِ اخلاص سے محرومی کے باعث کسی بھی دروازے پر جھک سکتا ہے اور اپنے اس جذبۂ محبت کو جس آستانہ پر چاہے بھینٹ چڑھا دیتا ہے۔ کبھی حسین صورت پر ریکھتا ہے تو ایسے ایسے پست اور ذلیل انسانوں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کا غلام بن کر رہ جاتا ہے جو عام حالات میں خود اس کی غلامی کی بھی اہلیت نہیں رکھتے۔ اور کبھی شوقِ نمود اور تمنائے ریاست کا دیوانہ بن جاتا ہے تو ذرا سی بات پر مگن ہو جاتا ہے اور معمولی سی بات پر آپے سے باہر۔ خوشامدیوں کا غلام بن جاتا ہے، اگرچہ وہ اس کی کتنی ہی جھوٹی تعریف کریں، اور ملامت گروں کے خون کا پیاسا ہو جاتا ہے، اگرچہ ان کی ملامت کتنی ہی مبنی برصداقت کیوں نہ ہو۔ اور کبھی مال و دولت کا حلقۂ عبدیت اپنی گردن میں ڈال لیتا ہے۔ غرضیکہ جو دل فریب چیز بھی سامنے آگئی اس نے اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیا۔ انجام کار، اس کی خواہشِ نفس ہی اس کا معبود ہو جاتی ہے، پھر زندگی کا جو قدم بھی وہ اٹھاتا ہے ہدایتِ الٰہی سے بے نیاز ہو کر ہی اٹھاتا ہے۔

نفسِ انسانی کی یہی دو حالتیں ہو سکتی ہیں۔ یا تو وہ اللہ واحد کا مخلص پرستار رہے یا پھر مخلوقات کا بندہ ہو کر رہے اور مختلف قسم کے شیاطین اس کے دل و دماغ پر چھا جائیں۔ تیسری کوئی راہ نہیں ہے۔ کیونکہ قلبِ انسانی اگر ماسوا سے کٹ کر اللہ واحد کا گرویدہ نہیں ہے تو شرک کی نجاستوں سے اس کا آلودہ ہونا ایک امرِ یقینی ہے۔ قرآن مجید جس ایمان کا مطالبہ کرتا ہے اس کی حقیقت اس سے ذرا بھی مختلف یا کم نہیں ہے۔ فرماتا ہے :-

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ
مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ وَاتَّقُوْهُ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا
مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ۔

پس تو اپنے رخ کو، یکسو ہو کر، دینِ اسلام کی طرف سیدھا کر، ۔ ۔ ۔ ۔ یہی فطری دین ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ اس کی طرف جھکتے ہوئے، اور اس سے ڈرو اور نماز قائم کرو اور مشرکوں میں سے نہ ہو۔

تمام بنی نوعِ انسان انہی دو گروہوں میں منقسم ہیں۔ ایک تو حنیف و مخلص بندوں کا گروہ جو خدا ہی کی محبت اور عبودیت اور مخلصانہ طاعت کا علمبردار ہے۔ دوسرا مشرکین کا گروہ جو ہوائے نفس کا پرستار ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم اور آلِ ابراہیم کو پہلے گروہ کا امام قرار دیا ہے، جس طرح اس نے فرعون اور آلِ فرعون کو دوسرے گروہ کا پیشوا قرار دیا ہے :-

وَوَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ نَافِلَةً وَ
كُلًّا جَعَلْنَا صٰلِحِيْنَ وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ
بِاَمْرِنَا ۔ ۔ ۔ ۔ الخ

اور ہم نے ابراہیم کو بخشے اسحاق اور یعقوب بطورِ عطیہ، اور ان میں سے ہر ایک کو ہم نے صالح بنایا اور ہم نے ان کو امام بنایا جو ہمارے حکم کے مطابق لوگوں کی رہنمائی کرتے تھے۔

فرعون اور آلِ فرعون کے متعلق فرمایا :-

وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ۔ ۔ الآیہ

اور ہم نے ان کو گمراہی کا لیڈر بنایا جو لوگوں کو آگ کی طرف بلاتے تھے۔

فتنۂ وحدۃ الوجود اس گروہِ فرعونی کی ضلالت کی ابتداء اس غلط نظریہ سے ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا اور قضا، مرضی اور مشیت دونوں ایک چیز ہیں، اور انتہا اس کفرِ خالص پر ہوتی ہے کہ خالق اور مخلوق دونوں ایک ہی شے ہیں۔ جو خالق ہے وہی مخلوق ہے اور جو مخلوق ہے وہی خالق ہے۔ ان کو یہ اصرار ہے کہ مخلوق بھی خالق کی ہم پلہ ہے حالانکہ ابراہیمؑ کا اعلان یہ ہے کہ "تم اور تمہارے گمراہ آباء و اجداد نے جن چیزوں کو معبود بنا رکھا ہے وہ سب کے سب، ماسوا پروردگارِ عالم کے، میرے دشمن ہیں"

اَفَرَءَيْتُمْ مَّا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمُ الْاَقْدَمُوْنَ فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّيْۤ اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں، ان لوگوں کے مسلک کی بنیاد بعض مشائخ کے متشابہ اقوال پر ہے، یہ غریب دبخار تاویل اور زیغ قلب وفکر کی اسی بیماری میں مبتلا ہو گئے جس کے شکار نصاریٰ ہو گئے تھے۔

فنا ان متشابہ اقوال میں سے مثال کے طور پر ایک مشہور عام لفظ فنا کا لے لو اور دیکھو کہ اس ایک لفظ کے پردہ میں کیسے کیسے خطرناک اور سراپا الحاد فتنے چھپے ہوئے ہیں۔

فنا کے تین درجے ہیں۔ ایک درجہ تو وہ ہے جو انبیائے کرام اور اولیائے کاملین کو حاصل تھا، دوسرا درجہ عام صلحائے امت اور کم مرتبہ اولیاء کا ہے۔ تیسرا درجہ منافقوں اور ملحدوں کا حصہ ہے۔

پہلے درجہ کی حقیقت یہ ہے کہ عابد کی نگاہ میں اللہ کے سوا ہر شے بے حقیقت ہو کر رہ جائے، خدا ہی سے محبت ہو، اسی کی بندگی ہو، اسی پر بھروسہ ہو اور اسی سے ہر طرح کی مدد چاہی جائے۔ بندگی کا کمال یہ ہے کہ بندہ وہی پسند کرے جو خدا کو پسند ہو اور اسی چیز سے محبت رکھے جو خدا کو محبوب ہے۔ مثلاً ملائکہ، انبیاء اور صلحاء۔ جس دل پر یہ حالت طاری ہو جائے اس کو قرآن نے "قلب سلیم" کہا ہے۔ سلیم کے معنی ہیں محفوظ، قلب سلیم وہ قلب ہے جو ماسوائے اللہ سے یا ماسوائے عبادت الٰہی سے یا ماسوائے مراد الٰہی سے یا ماسوائے محبت الٰہی سے پاک اور محفوظ ہو۔ خدا کی محبت اور بندگی کے اس مقام کو آپ فنا کے لفظ سے تعبیر کریں یا کسی اور لفظ سے، ہمیں اس سے چنداں بحث نہیں ہے، البتہ یہ حقیقت ہے کہ اصلی اسلام یہی ہے۔

دوسری قسم فنا کی یہ ہے کہ ماسوا کے شہود سے قلب یکسر بے نیاز ہو جائے۔ اکثر سالک اسی کیفیت میں رہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے دل خدا کی محبت، عبادت اور اس کے ذکر کی طرف پوری طرح کھنچ اٹھتے ہیں اور چونکہ دل کمزور ہوتے ہیں اس وجہ سے مشاہدہ جلال وجمال خداوندی سے ایسے مرعوب ومتحیر ہو جاتے ہیں کہ ان میں اتنی قوت باقی نہیں رہ جاتی کہ ماسوا کو دیکھ سکیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ غیر اللہ کا ان کے دلوں میں سرے سے گذر ہی نہیں ہوتا بلکہ وہ اس کا احساس تک کھو بیٹھتے ہیں۔ یہی کیفیت قلبی تھی ام موسیٰ کی جب حضرت موسیٰ کو موجوں کے دوش پر بحکم الٰہی سوار کرایا گیا اور جس کے متعلق قرآن نے فرمایا ہے کہ:

وَاَصْبَحَ فُؤَادُ اُمِّ مُوْسٰى فٰرِغًا . . . . الآیۃ۔ موسیٰ کی ماں کا دل "خالی" ہو گیا۔

"خالی ہو گیا" یعنی موسیٰ کے ذکر وفکر کے سوا ہر شے سے خالی ہو گیا۔ اس میں صرف موسیٰ ہی موسیٰ رہ گئے۔ یہ کیفیت ایسے اشخاص پر بالعموم طاری ہو جایا کرتی ہے جن کو محبت یا خوف یا رجا کے کسی غیر معمولی جذبہ سے یکایک سامنا ہو جاتا ہے، اس وقت ان کے دل میں اس شے کے سوا جس سے محبت یا خوف یا رجا کا جذبہ وابستہ ہے کسی اور چیز کا تصور نہیں رہ پاتا۔

پس ذکر الٰہی میں بھی اس صورت حال کا پیش آنا ایک امر واقعہ ہے، اور جب کسی ذاکر کو یہ مرحلہ پیش آ جاتا ہے اس وقت من وتو کی تمیز اٹھ جاتی ہے، وہ اپنے محبوب کو پا کر خود اپنے وجود سے غافل ہو جاتا ہے اور اپنے مشہود میں محو ہو کر اپنے آپ کو بھی فراموش کر بیٹھتا ہے، اس کی نگاہ باطن صرف ایک ذات ازلی وحقیقی یعنی اللہ تعالیٰ ہی کو موجود باقی ہے اور باقی ساری کائنات اس کے لیے فنا ہو جاتی ہے۔ جب یہ کیفیت شدت وقوت اختیار کر لیتی ہے اور ساتھ ہی سالک کا دل اتنا کمزور بھی ہوتا ہے کہ من وتو کے امتیاز میں حیران ساہو رہ جاتا ہے تو اس کے ذہن پر یہ گمان مستولی ہو جاتا ہے کہ وہی آپ اپنا محبوب ہے۔

یہ وہ مقام ہے جس کی تمیز اور معرفت میں کتنی ہی قوموں نے ٹھوکریں کھا کر اپنے آپ کو گمراہی کے گڑھے میں ڈال دیا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انھوں نے اس کیفیت کو "اتحاد" سمجھ لیا یعنی یہ کہ یہ وہ مقام ہے جہاں عاشق اپنے محبوب میں جا ملتا ہے اور پھر ان دونوں کے وجود میں کوئی فرق، کوئی غیریت اور کوئی دوئی نہیں رہ جاتی بلکہ دونوں مل کر ایک وجود ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہ صریح غلطی اور نادانی ہے کیونکہ خالق کے ساتھ کوئی چیز بھی متحد نہیں ہو سکتی اور خالق کیا، کوئی چیز بھی کسی دوسری چیز کے ساتھ متحد نہیں ہو سکتی سوائے اس کے کہ وہ دونوں اپنی ماہیت سے دست کش ہو جائیں یا ان میں فساد رونما ہو جائے یا ان دونوں کے ملنے سے ایک تیسری شے پیدا ہو جائے جو ان دونوں میں سے ہر ایک سے مباین حقیقت رکھتی ہو، جس طرح پانی اور دودھ یا پانی اور شراب مل کر ایک تیسری شے بن جاتے ہیں کہ پھر نہ اسے پانی کہہ سکتے ہیں نہ دودھ نہ شراب۔ اور ظاہر ہے کہ ذات باری کے متعلق ان میں سے کسی صورت اتحاد کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے عاشق خدا اور خدا کا متحد ہونا ایک امر ناممکن ہے۔ ان دونوں کی مراد اور مرضی میں اتحاد ہو سکتا ہے، ان کی پسند اور ناپسند میں یکسانی ہو سکتی ہے کہ جو چیز محبوب کو بھلی معلوم ہو اس کو بھی بھلی لگے اور جس چیز سے محبوب کو نفرت ہو اس کو بھی نفرت ہو، جس کو محبوب دوست رکھتا ہو اس کو وہ بھی دوست رکھے اور جس کو محبوب دشمن سمجھتا ہو اس کو وہ بھی دشمن سمجھے۔ یہی اتحاد ممکن ہے اور واقعہ یہ ہے کہ یہی اور صرف یہی اتحاد ہوتا بھی ہے۔

فنا کی یہ نوعیت اپنے اندر گوناگوں نقائص رکھتی ہے اور اولیائے کاملین مثلاً حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ اور دیگر اکابر مہاجرین و انصار سابقین میں سے کوئی بھی اس میں نہیں پڑا، اور انبیائے کرام کا تو ذکر ہی کیا۔ فنا کی یہ قسم صحابہ کے بعد عالم وجود میں آئی کیونکہ اس فنا کا مولد و منشا، دراصل ضعف قلب ہے اور صحابہ کے قلوب واردات ایمانی کا تحمل کرنے میں اتنے کامل، اتنے قوی اور اتنے ثابت و ضابط تھے کہ کسی حال میں بھی ان کی عقلیں معطل نہ ہوتی تھیں، نہ ان پر کوئی ضعف طاری ہوتا تھا نہ کوئی سکر، نہ کبھی ان پر غشی کی حیرانی طاری ہوتی تھی، نہ وجد و حال کی وارفتگی۔ ان باتوں کی ابتدا تو بصرہ کے تابعین سے ہوئی ہے۔ سب سے پہلے وہیں یہ بات دیکھنے میں آئی کہ بعض لوگوں نے قرآن سنا اور اس کے جلال کی تاب نہ لا کر بے ہوش ہو گئے۔ اور بعض کی اسی عالم میں روح ہی پرواز کر گئی۔ مثلاً ابو جہیر اور زرارہ بن اوفی قاضی شہر۔ پھر یہ سلسلہ آگے چلا اور شیوخ صوفیہ میں سے بھی ایسے لوگ گذرے ہیں جن پر فنا اور سکر کی ایسی کیفیت طاری ہوئی جس نے ان کی قوت تمیز کو ناکارہ کر دیا۔ یہاں تک کہ وہ اسی عالم مدہوشی میں ایسی باتیں کہہ گئے جن کی غلطی کا، درستگی حواس کے بعد، انھوں نے خود اعتراف کیا۔ جیسا کہ حضرت ابو یزیدؒ، ابو الحسنؒ اور ابوبکر شبلیؒ وغیرہ بزرگوں کی بابت بیان کیا جاتا ہے۔ ان کے برخلاف حضرت ابو سلمان دارانی، معروف کرخی، فضیل بن عیاض اور حضرت جنید وغیرہ جن کے قلوب مضبوط تھے اور جن کے قوائے عقل و تمیز ہر حال میں بحال رہتے تھے، کبھی اس کیفیت میں مبتلا نہ ہوئے۔ محبت و بندگی کا حقیقی کمال یہی ہے۔ جو لوگ اس نعمت کمال سے بہرہ ور ہوتے ہیں ان کی فضائے عقل میں خدا کی محبت، عبادت اور طلب کے سوا کسی غیر شے کا گذر نہیں ہوتا۔ مگر اس کے ساتھ ہی وہ علم اور وہ قوت تمیز ان کے ساتھ رہتی ہے جو انھیں تمام امور اور اشیاء کا ان کی اصل صورت میں مشاہدہ کراتی رہتی ہے۔ وہ اپنی بصیرت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں کہ تمام کائنات اللہ تعالیٰ ہی کے امر و حکم سے قائم ہے اور اسی کا مشیت ان سب کی مدبر ہے، پھر اس سے بھی آگے بڑھ کر ان کے سامنے یہ راز فطرت بے نقاب ہو جاتا ہے کہ ساری کائنات اللہ جل مجدہ کے سامنے سرنگندہ اور اس کی تسبیح میں مشغول ہے۔ یہ مشاہدہ ان کے لیے بڑی عبرت و موعظت کا سبب بن جاتا ہے اور ان کے اخلاق دینی، عبادت الٰہی اور خالص خدا پرستی کے جذبات کے لیے مہمیز کا کام کرتا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قرآن جس حقیقتِ عبودیت کی طرف بلاتا ہے وہ یہی ہے۔ سچے مومنوں اور کامل عارفوں نے، جن کے سرتاج ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، اسی عبودیت کو اختیار کیا۔ چنانچہ جب شبِ معراج میں آپ آسمانوں پر تشریف لے گئے اور وہاں آیاتِ الٰہی کا آپ نے نظارہ فرمایا اور پھر عبد و معبود میں ناقابلِ فہم و بیان راز و نیاز ہوئے، تو باوجودیکہ یہ قربِ الٰہی کا وہ مقام تھا جو کسی کو بھی نصیب نہ ہوا مگر آپ کی حالت میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوا۔ نہ کسی قسم کی خود فراموشی طاری ہوئی اور نہ آپ کی عقل و تمیز معطل ہوئی۔ بخلاف موسیٰ علیہ السلام کے کہ طور پر تجلیٔ رب کا عکس دیکھنے کی بھی تاب نہ لاسکے اور بے ہوش ہوگئے۔

فنا کی تیسری قسم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی معبود دکھائی نہ پڑے اور خالق کا وجود ہی عین مخلوقات کا وجود قرار پا جائے گویا عبد اور معبود میں کوئی فرق نہ رہ جائے۔ فنا کی یہ تعریف ان گمراہوں اور ملحدوں کے نزدیک ہے جو حلول اور اتحاد کے قعرِ ضلالت میں جا گرے۔

کلامِ مشائخ کی صحیح تاویل اہلِ حق و معرفت شیوخ نے جو اس قسم کے جملے کہے ہیں کہ "ما اریٰ غیر اللہ"، یا "لا انظر الیٰ غیر اللہ" وغیر ذٰلک قرآن کی مراد ان اقوال سے یہ ہے کہ "میں اللہ کے سوا کسی کو کائنات کا پروردگار یا خالق یا مدبر یا الٰہ نہیں دیکھتا۔" اور "میں کسی غیر کی طرف محبت یا خوف یا امید کی نگاہیں نہیں ڈالتا" کیونکہ انسان کی نگاہ اسی چیز کی طرف اٹھتی ہے جو اس کے دل میں کوئی جگہ رکھتی ہو جس سے اسکو کوئی محبت یا خوف ہو، ورنہ جس چیز سے نہ اس کو کوئی محبت ہو، نہ کوئی عداوت، نہ کوئی طمع ہو نہ کوئی خوف، اس کی طرف اس کا دل کبھی متوجہ نہ ہوگا اور اگر کبھی اس کی نگاہ اس پر اتفاقاً پڑے گی بھی تو بالکل اسی طرح جیسے راہ چلتے کسی اینٹ پتھر پر پڑ جایا کرتی ہے۔ پس یہ ایک حقیقت ہے اور نہایت قابلِ ستائش حقیقت ہے کہ بزرگانِ دین مخلوقات پر اسی حیثیت سے نظر ڈالتے تھے اور ان کے اقوالِ مذکورہ کا یہی مدعا ہے۔ وہ ان جملوں میں توحید اور اخلاص کی اس کامل اور بے آمیز حقیقت کا اعلان فرماتے ہیں کہ بندہ کو غیر اللہ کی طرف التفات نہ کرنا چاہیے۔ اور نہ کسی ماسوا کی طرف محبت یا خوف یا رجا کی آنکھ اٹھانی چاہیے، بلکہ اس کے دل کو تمام مخلوق کے ذکر و فکر سے خالی اور بے نیاز ہونا چاہیے اور جب بھی ان کی طرف دیکھے اللہ کے نور کے ساتھ دیکھے۔ یعنی حق کے کانوں سے سنے، حق کی نظروں سے دیکھے، حق کے ہاتھوں سے پکڑے، حق کے پاؤں سے چلے، اس کائنات کی انہی چیزوں سے محبت رکھے جن سے خدا کو محبت ہو، اور ان سے نفرت کرے جن سے خدا کو نفرت ہو۔ اس دنیا کو برتنے میں اللہ سے ڈرتا رہے اور اللہ کی رضا کے معاملہ میں ساری مخلوق کی مخالفتوں اور عداوتوں سے بے خطر ہو۔ یہی وہ دل ہے جو سلیم اور حنیف ہے، جس کو عارف و موحد کہا گیا ہے اور جس کو مومن و مسلم کا خطاب زیب دیتا ہے۔ جس طرح فنا کی تیسری قسم یعنی فنا فی الوجود فرعون اور اس کے اتباع مثلاً قرامطہ وغیرہ کی تحقیق ہے اسی طرح کی پہلی قسم انبیائے کرام اور ان کے اتباع صالحین کے مخصوصات میں سے ہے۔ اور یہی اس بات کی دلیل ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک محمود ہے۔ جتنے بھی اور قابلِ اتباع مشائخ گذرے ہیں سب کا اللہ رب السموات والارض کے متعلق یہی تصور اور اعتقاد تھا کہ وہ ساری مخلوق سے بالکل الگ اور جداگانہ ہستی ہے۔ وہ قدیم ہے اور باقی ساری موجودات حادث ہیں اور اس ذاتِ قدیم کا تمام اشیائے حادث سے الگ اور منفرد ہونا ایک امرِ ضروری ہے۔ انھوں نے راہِ سلوک میں پیش آنے والے امراض و شبہاتِ قلب سے بھی پوری طرح باخبر کر دیا ہے کہ بعض لوگ سلوکِ باطن کے دوران میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مشاہدہ تو مخلوقات کا کرتے ہیں لیکن قلب میں قوتِ تمیز کے فقدان کے باعث انھیں کو خالق گمان کر بیٹھتے ہیں۔ بالکل اسی طرح ایک آدمی سورج کی شعاعوں کو دیکھ کر یہ گمان کر بیٹھے کہ یہی سورج ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ نہیں ہوتی۔

وحدۃ الشہود

فنا کی اصطلاح سے ملتی جلتی "فرق اور جمع" کی اصطلاحیں بھی ہیں اور ان میں بھی اسی قسم کے خطرناک رسوم عبادت اور تصورات داخل ہو گئے ہیں جو فنا کی اصطلاح میں موجود ہیں۔ ایک بندہ جب مخلوقات کی گوناگونی اور کثرت پر نگاہ ڈالتا ہے تو اس کی نگاہ اور اس کا قلب دونوں ہی ان میں الجھ کر رہ جاتے ہیں، وہ مختلف چیزوں کو سامنے پاتا ہے اس لیے مختلف سمتوں میں اس کی نظریں اٹکی رہتی ہیں۔ کہیں شوق و محبت کی بنا پر، کہیں خوف کی بنا پر اور کہیں امید کی بنا پر۔ پھر قلب و نظر کے اضطراب اور تفرق کے بعد جب اس کو "جمع" کا منبع اطمینان ہاتھ آجاتا ہے تو اس کی آوارگی نظر جمعیت سے بدل جاتی ہے اور اس کا دل خدا کی وحدانیت اور عبودیت پر آکر جم جاتا ہے۔ اس وقت اس کی محبت، استعانت، خوف، رجا اور توکل کے سارے احساسات اسی ایک ذات والاصفات پر آکر مرتکز ہو جاتے ہیں۔ ایسی حالتِ استغراق میں بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس کے قلب کو اتنی فرصت نہیں ملتی کہ وہ مخلوقات کی طرف بھی دیکھ سکے تاکہ خالق اور مخلوق میں امتیاز کرے، اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ قلب مرکزِ حق پر معتکف ہو جاتا ہے اور خلق سے بالقصد توجہ پھیر لیتا ہے۔ یہ فنا کی قسم ثانی سے بالکل مشابہ کیفیت ہے اور ضعفِ قلب کا نتیجہ ہے۔

اس کے بعد "جمع" کی ایک دوسری قسم آتی ہے۔ وہ یہ کہ ذاتِ باری تعالیٰ پر دل سے یکسوئی کے ساتھ جم جانے کے باوجود اس کو یہ دکھائی دیتا ہو کہ تمام کائنات اللہ ہی کی قدرت سے قائم اور اسی کے حکم و تدبیر سے مصروفِ عمل ہے، اور یہ کہ مخلوقات کی ساری کثرت اور گوناگونی، اللہ تعالیٰ کی وحدانیت میں گم اور معدوم ہے، اور یہ کہ اللہ ہی ساری مخلوق کا پروردگار، معبود، خالق اور مالک ہے۔ ایسا دل ایک طرف تو اخلاص و محبت، خوف و رجاء، توکل و استعانت، حب للہ اور بغض للہ کے جذباتِ ملکوتی سے لبریز اور ذاتِ خداوندی پر مجتمع رہتا ہے اور دوسری طرف خالق اور مخلوق کا فرق و امتیاز بھی اس کی نگاہ سے اوجھل نہیں ہونے پاتا۔ یہی حقیقی شہود ہے، یہی سچی عبدیت ہے اور یہی کلمہ طیبہ کی صحیح روح ہے۔ لا الٰہ الا اللہ کی شہادت کا عملی مفہوم اس کے سوا کچھ ہے ہی نہیں۔ کیونکہ یہ چیز قلب میں غیر اللہ کی معبودیت کا کوئی دھندلا سا نشان بھی نہیں چھوڑتی اور حق تعالیٰ کی الٰہیت کا عمیق اور ہمہ گیر نقش اس پر بٹھا دیتی ہے، گویا ہر ایک مخلوق کی معبودیت کی نفی اللہ رب العالمین کی معبودیت کا کامل اور لازوال اثبات کر دیتی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دل اسی ایک ذات پر آکر مجتمع ہو جاتا ہے اور غیر اللہ کے اضطراب انگیز تعلقات سے بالکل کنارہ کش ہو کر رہ جاتا ہے۔ پھر اس کی تمام تر توجہات کا مرکز اللہ ہی رہتا ہے اور اس کے ذکر و فکر، عشق و محبت، تعظیم و عبادت، طلبِ رضا و اطاعتِ امر اور خوف و رجا کے جذبات اسی ایک کعبۂ مقصود کے طواف میں مشغول رہتے ہیں، لیکن ساتھ ہی وہ ایک لمحے کے لیے بھی اس حقیقت کو فراموش نہیں کرتا کہ مخلوقاتِ عالم واقعہ میں اپنا الگ اور مستقل وجود رکھتی ہیں، ایسا وجود جو وجودِ باری تعالیٰ سے یکسر مبائن ہے۔

اس مقام تک پہنچ جانے کے بعد وہ صحیح معنوں میں موحد بن جاتا ہے۔ چنانچہ اس رازِ توحید کی طرف ان احادیث سے کھلی ہوئی رہنمائی ہوتی ہے جن میں فرمایا گیا ہے کہ "سب سے افضل ذکر لا الٰہ الا اللہ ہے"۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ذکرِ الٰہی کے بدعی اور غیر مشروع طریقے

بدقسمتی سے لوگوں نے یہاں بھی کج ذہنی کے نہایت خطرناک مظاہرے کیے ہیں اور اتنے واضح ارشاد کے باوجود یہ گمان کر بیٹھے کہ لا الٰہ الا اللہ کا ذکر محض عوام کے لیے ہے، اور خواص کا طریقۂ ذکر یہ ہے کہ صرف لفظ "اللہ" کا ورد کیا جائے اور خاص الخواص کو اس لفظ کے اظہار کی بھی ضرورت نہیں، ان کے لیے "یاھو" کا ذکر کافی ہے۔ لیکن یہ کھلی ہوئی غلطی اور گمراہی ہے، اور ان کے اپنے ان دعاوی پر آیاتِ قرآنی سے استدلال تو تحریف اور غلط بیانی کا شاہکار ہے۔ مثال کے طور پر ان کے بعض استدلالات کو لیجیے۔ آیت قُلِ اللّٰهُ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِيْ خَوْضِهِمْ يَلْعَبُوْنَ۔ سے استدلال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ دیکھو یہاں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ کہو "اللہ" معلوم ہوا کہ صرف "اللہ" "اللہ" کہنا ہی ذکر میں کافی ہے۔ لیکن ایک معمولی عقل و فہم کا آدمی بھی، جس کو قرآنی تعلیمات اور عربی اسالیب سے ذرا بھی مس ہو، سیاق کلام کو سامنے رکھ کر بادنیٰ تامل محسوس کر سکتا ہے کہ لفظ اللہ یہاں تنہا نہیں ہے بلکہ ایک پورے جملے کا ایک ٹکڑا ہے جس کو سیاق عبارت اور قرینۂ مقالی کی بنا پر حذف کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ استفہام کے جواب بالعموم اسی طرح دیے جاتے ہیں کہ جملۂ سوالیہ کے بیشتر الفاظ، جن کو جواب میں دہرانا ہو، حذف کر دیے جاتے ہیں۔ اس جملہ کو اگر ظاہر کر دیا جائے تو یوں ہو گا کہ قل اللہ الذی انزل الکتاب الذی جاء بہ موسیٰ۔ کیونکہ یہ قول ان یہودیوں کے رد میں ارشاد ہوا ہے جو نزول قرآن کے بارے میں کہتے تھے کہ "مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَيْءٍ۔ یعنی اللہ نے کسی بشر پر کوئی چیز نہیں اتاری ہے۔" اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر یہ حقیقت ہے کہ اللہ بشر پر اپنا کلام نہیں اتارا کرتا تو پھر بتاؤ "وہ کتاب جو موسیٰ لے کر تمہارے پاس آئے تھے کس نے اتاری تھی؟ (مَنْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ الَّذِيْ جَآءَ بِهٖ مُوْسٰى)۔ پھر خود ہی فرمایا ہے کہ "اے پیغمبر کہہ دو" اللہ نے"۔ یعنی کتاب موسیٰ کو اللہ ہی نے نازل کیا تھا۔

اسم ضمیر یعنی "یا ھو" کو ذکر مشروع قرار دینے کے لیے ان لوگوں نے آیت وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ کو اپنی تاویلاتِ فاسدہ کا تختۂ مشق بنایا ہے۔ ان کے نزدیک اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ "ھُو" کی تاویل خدا اور راسخین فی العلم کے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔" لیکن ظاہر ہے کہ کلام الٰہی کے ساتھ اس سے بڑھ کر ظلم اور کیا ہو سکتا ہے جو یہاں اختیار کیا گیا ہے۔

الغرض لفظ مفرد کے ذریعہ، خواہ وہ ظاہر ہو یا مضمر، خدا کا ذکر نہ تو سلف صالحین سے منقول ہے نہ پیغمبر نے اس کو مشروع قرار دیا ہے۔ کیونکہ ایک لفظ جملہ نہیں ہو سکتا جس کا کوئی مفید یقین مفہوم ہو۔ اس لیے اس کو ایمان یا کفر کا مدار نہیں قرار دیا جا سکتا۔ ایک لفظ صرف تصور مطلق پیدا کر سکتا ہے جس پر نفی یا اثبات کا حکم نہیں لگایا جا سکتا الا آنکہ قلب میں پہلے سے کوئی ایسی معرفت اور حالت موجود ہو جو اس لفظ سے مل کر ایک متعین مفہوم پیدا کر دے، ورنہ عام حالات میں لفظ مفرد قلب کو ایک مجرد تصور کے سوا کوئی مفید یقین مفہوم نہیں بخشتا۔ اور شریعت نے جتنے اذکار تعلیم فرمائے ہیں وہ سب کے سب ایسے ہی ہیں جو بذات خود، نہ کہ کسی غیر شے کی مدد سے، مفید یقین معرفت پیدا کرنے والے ہیں۔ اس نے ہمیں اس قسم کے ذکر کی دو دھاری تلوار چلانے کی قطعی اجازت نہیں دی ہے، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جن لوگوں نے یہ خطرناک کھیل کھیلا انھوں نے اس تلوار سے خود اپنی گردنیں آپ کاٹ لیں اور توحید و معرفت الٰہی کے مقام رفیع پر پہنچنے کی بجائے طرح طرح کے الحاد اور زندقہ میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اتحاد کے قعر ضلالت میں جا گرے۔ خصوصاً اسم مضمر یعنی "یا ہو یا ہو" کا ذکر تو خوفناک فتنوں کا سرچشمہ ہے۔ اس طریقۂ ذکر کو طریقۂ نبوی سے کوئی دور کا علاقہ بھی نہیں بلکہ سرتاپا بدعت اور ضلالت ہے۔ کیونکہ جو شخص "یا ہو یا ہو" کی رٹ لگاتا رہتا ہے اور ذات باری کا اصل نام نہیں لیتا اس کے اس مبہم قول میں "ہو" کی ضمیر کا مرجع صرف وہی چیز ہو سکتی ہے جو اس کے قلب میں پہلے سے متصور ہو۔ اور یہ ایک بدیہی امر ہے کہ ہر قلب کا ہر حال میں، ذات الٰہی کا صحیح تصور رکھنا اور نورِ حق سے معمور ہونا ضروری نہیں۔ وہ کبھی گمراہ ہوتا ہے، کبھی ہدایت یاب، کبھی معبود اور معبودیت کا صحیح تصور رکھتا ہے اور کبھی غلط۔ اس لیے "یا ہو" بکتے رہنے کے معنی لازمی طور پر اللہ واحد ہی کو پکارنے کے نہیں ہو سکتے، بلکہ اس امر کا بھی امکان ہے کہ جس ذات کو وہ پکار رہا ہے اس کا تصور اس کے ذہن میں اس تصور سے بالکل جداگانہ ہو جو اللہ وحدہٗ لاشریک کا ہے۔

پس یہ طریقۂ ذکر گوناگوں دشمن ایمان خطرات سے پُر ہے اور کوئی ایک لفظ تن تنہا، دین میں کوئی اعتبار نہیں رکھتا اور جمہور اہل اسلام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ فقط ایک لفظ "اللہ" کہہ دینے پر ایمان کا حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ شریعت بیضا نے کسی کو لفظ مفرد کے ذریعہ ذکر کرنے کی اجازت نہیں دی ہے۔

یہاں قرآن مجید کی ان آیات سے دھوکا نہ کھانا چاہیے جن میں "ذکر اسم رب" اور "تسبیح اسم رب" کے الفاظ آتے ہیں۔ ان آیات میں "ذکر اسم" سے مراد یہ ہرگز نہیں ہے کہ صرف "اللہ" کا لفظ دہراتے رہو بلکہ خود قرآن کے مبلغ اور شارح نے اس "ذکر" کے مفہوم اور طریقہ کی توضیح فرما کر ہمیں بتا دیا ہے کہ ان جملوں کا ورد کرو جو اللہ تعالیٰ کے ذکر اور اس کی تسبیح پر مشتمل ہوں۔ مثلاً جب آیت فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ نازل ہوئی تو رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ "اس حکم پر رکوع میں عمل کرو"، اور جب آیت "سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى" نازل ہوئی تو فرمایا کہ "اس حکم پر سجدہ میں عمل کرو"۔ اور پھر ان احکام پر عمل کرنے کا طریقہ یہ بتایا کہ رکوع میں "سبحان ربی العظیم" اور سجدہ میں "سبحان ربی الاعلیٰ" کہا جائے۔ معلوم ہوا کہ اسم رب کی تسبیح سے مراد ایسے جملوں کا ورد ہے جو اللہ تعالیٰ کی حمد اور پاکی کا مفہوم رکھتے ہوں نہ کہ فقط ایک لفظ "اللہ"۔ چنانچہ مسلمانوں کے لیے نمازوں، اذانوں، عیدوں اور حج کے مراسم میں جو اذکار مقرر اور مشروع کیے گئے ہیں وہ سب کے سب جملۂ تامہ ہیں نہ کہ الفاظ مفردہ۔ الفاظ مفردہ کا ذکر، خواہ وہ ظاہر ہوں یا مضمر، سرے سے شریعت میں کوئی بنیاد ہی نہیں رکھتا چہ جائے کہ اس کو خواص اولیاء اور عارفین کاملین کا ذکر خصوصی کہا جائے۔ یہ تو طرح طرح کی بدعتوں اور گمراہیوں کا سرچشمہ ہے۔

سلامتی دین کی راہ

جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، دین کی بنیاد دو چیزوں پر ہے، ایک تو یہ کہ اللہ ہی کی بندگی کی جائے، دوسری یہ کہ اللہ کی بندگی اور عبادت اس طریقہ پر کی جائے جو مشروع ہو، نہ کہ بدعی طریقوں سے۔ یہی حقیقت ہے جو آیت ذیل میں واضح کی گئی ہے:۔

فَمَنْ كَانَ يَرْجُو لِقَاءَ رَبِّهِ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِ أَحَدًا۔

سو جو کوئی اپنے پروردگار سے ملنے کا اندیشہ رکھتا ہو اس کو چاہیے کہ اچھے کام کرے اور اپنے رب کی بندگی میں کسی کو شریک نہ کرے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور پھر یہی وہ جامع معنی ہے جو شہادتین سے ظاہر و باطن میں جلوہ گر ہے۔ کلمہ اول لاالٰہ الا اللہ میں اس بات کا اقرار ہے کہ ہم خدا کے سوا کسی کی عبادت نہیں کرتے اور کلمۂ ثانیہ یعنی محمد رسول اللہ میں اس امر کی شہادت ہے کہ محمد ہی وہ پیامبر ہیں جنھوں نے معبود کے احکام ہم تک پہنچائے ہیں، اس وجہ سے ہمارے لیے یہ ضروری ہے کہ ان کے ارشادات کی تصدیق اور ان کے احکام کی اطاعت کریں۔ خدا کے اس پیامبر نے اپنے فرائض نبوت کو ادا کرتے ہوئے ان تمام باتوں اور طریقوں کی، روز روشن کی طرح وضاحت کر دی ہے جن کے ذریعہ ایک بندہ کو اپنے معبود کی عبادت کرنی چاہیے اور ان تمام طرق عبادت سے روک دیا ہے جو من گھڑت ہوں اور جن کی اصل کتاب و سنت میں نہ ملتی ہو۔ بنابریں جس طرح ہم اس امر کے مکلف ہیں کہ صرف اللہ ہی سے ڈریں، اسی پر ہر معاملہ میں بھروسہ رکھیں، اسی سے مدد مانگیں اسی کو پکاریں، اسی کو اپنی رغبتوں کا مرکز بنائیں اور صرف اسی کی بندگی کریں، اسی طرح ہمیں یہ حکم بھی دیا گیا ہے کہ رسول کا اتباع کریں، اس کے احکام کی بلاچون وچرا پابندی کریں اور اس کے نقوش قدم کو اپنا ہادی ورہبر بنائیں، حلال اسے جانیں جس کو اس نے حلال گردانا ہو اور حرام اسے سمجھیں جس کو اس نے حرام ٹھیرایا ہو اور دین صرف اس چیز کو مانیں جس کا اس کے قول و فعل میں نشان ملتا ہو۔

پورا قرآن انہی حقائق اور مبادی دین کی تشریحات سے بھرا ہوا ہے، اس کے جس ورق کو دیکھو عبادت اور عبودیت کا یہی مفہوم بے نقاب نظر آئے گا۔ عبادت، انابت، خشیت، استعانت، توکل، خوف اور تقویٰ کا جہاں بھی ذکر ہو گا ہر ایک کی نسبت اللہ جل مجدہٗ کی طرف ہو گی، صرف دو چیزیں ایسی ہیں جن میں اللہ کے ساتھ اس کے رسول بھی شریک ہیں، ایک تو اطاعت، دوسری محبت۔ یعنی اطاعت اور محبت جس طرح خدا کی کرنی چاہیے، اسی طرح ــــ اس کی تبعیت میں ــــ رسول کی بھی کرنی چاہیے۔ باقی چیزوں میں رسول کسی معنی میں بھی اللہ کے شریک نہیں بلکہ عام انسانوں کی طرح خود وہ بھی اس پر مامور ہیں کہ اللہ واحد ہی کی عبادت کریں، اسی پر بھروسہ رکھیں، اسی سے طلب اعانت کریں اور اسی کے حضور اپنی التجائیں پیش کریں۔ شیطان نے نصاریٰ وغیرہ کو اسی معاملہ میں گمراہ کیا اور وہ اپنے انبیاء اور اولیاء کو ان کے صحیح موقف پر نہ رکھ سکے، بلکہ اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ کی مخصوص صفات میں انھیں بھی شریک کر دیا۔ انھیں سے دعائیں اور التجائیں کرنے لگے اور انھیں پر توکل کرنے لگے۔ لیکن مومنین مخلصین کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت بخشی اور وہ صراط مستقیم پر چل کر مغضوبوں اور گمراہوں کے ملعون گروہوں میں شامل ہونے سے محفوظ رہے۔ انھوں نے دین کو اللہ ہی کے لیے خالص کیا، اپنی پیشانیاں اسی کے آستانہ پر جھکائیں، اسی کو مصیبتوں میں پکارا، اسی سے اپنی امیدیں وابستہ کیں، اسی کی بارگاہ میں عاجزانہ جھکے، اپنے معاملات کو اسی کے حوالے کر دیا اور ہر قدم پر اسی پر کامل بھروسہ رکھا۔ پھر اس کے رسولوں کی اطاعت کی، ان سے محبت کی، ان کی تعظیم و تکریم کی، ان سے دوستی اور موالات کا رشتہ استوار کیا، کٹھن گھڑیوں میں ان کے لیے جان کی بازی لگا دی، اپنے اعمال میں ان کی ہدایتوں پر کاربند رہے اور ان کے روشن کیے ہوئے چراغ سے کر زندگی کی منزلیں طے کیں۔

یہی وہ دین اسلام ہے جس کی تبلیغ و اشاعت کے لیے تمام انبیاء آتے رہے اور جس کے سوا اللہ کے دربار میں کوئی اور دین مقبول نہیں۔ اور یہی ہے عبادت کی حقیقت۔ اللہ تعالیٰ ہر مومن کو اس حقیقت کی کامل معرفت عطا فرمائے اور اس کے مقتضیات کے مطابق اپنی اپنی زندگیاں ڈھالنے کا عزم اور استقلال مرحمت کرے۔

© rasailojaraid.com

امامتِ تامّہ

یا

خلافتِ راشدہ کی حقیقت

(ماخوذ از منصبِ امامت از شاہ اسمٰعیل شہیدؒ)

(مترجمہ نعیم صدیقی)

خلافتِ راشدہ کی دو قسمیں خلافتِ تامہ کی دوسری تعبیر خلافتِ راشدہ یا خلافت علیٰ منہاج النبوۃ یا خلافتِ رحمت سے بھی کی جاتی ہے۔ اس منصب پر خلیفۂ راشد جب متمکن ہو گیا تو یہ قطعی ہے کہ نوعِ انسانی کی پرورش میں خدا تعالیٰ کی رحمت اپنے کمال کو پہنچ گئی لیکن اس رحمتِ ربانی کے کمالِ ظہور کے ساتھ اگر بندوں کے کمالِ روحانی کو بھی فروغ حاصل ہونے لگے تو پھر تو نورٌ علیٰ نور کا سماں بندھ جاتا ہے۔ اس نکتہ کی شرح یہ ہے کہ قیامِ خلافتِ راشدہ کے ساتھ خدا تعالیٰ کی طرف سے تو رحمت و انعام کا اتمام ہو جاتا ہے لیکن اہلِ زمانہ کی سعادت اس بات میں ہے کہ پوری امتِ مسلمہ کامل اتفاق سے خلافتِ راشدہ کو قبول کرے اور خلیفۂ راشد کے اقتدار کو دل و جان سے تسلیم کرے۔ اگر اس طرح خلافتِ ربانی کا ضبط و نظم قائم ہو جائے تو سیاستِ ایمانی[1] کے معاملات صحیح طور پر تکمیل پذیر ہو سکتے ہیں۔ ایسی خلافت کو "خلافتِ منتظمہ" کہتے ہیں۔ لیکن بعض اوقات زمانہ کے حالات کچھ ایسے ہوتے ہیں کہ خلیفۂ راشد تو بروئے کار آجاتا ہے اور خلافت کے قیام و حفظ کے لیے سرتوڑ کوشش بھی کرتا ہے، لیکن بدقسمتی سے جمہورِ اہلِ اسلام کی آرا کسی طرح ایک نقطہ پر مرتکز نہیں ہو پاتیں۔ یعنی پوری امت کی ہم آہنگی پیدا نہیں ہو سکتی۔ پس خلافت کی اس صورت کو کہ خلیفۂ راشد کے موجود ہونے کے باوجود اور اس کی ساری سعیِ قیامِ خلافت کے باوجود نظمِ خلافت کی ہمواری حاصل نہیں ہوتی، "خلافتِ غیر منتظمہ" کہتے ہیں۔

سو اس طرح خلافتِ راشدہ کی دو قسمیں ہو گئیں:

۱۔ خلافتِ منتظمہ، مثلاً خلفائے ثلاثہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی خلافت۔

۲۔ خلافتِ غیر منتظمہ، مثلاً حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی خلافت۔

---

[1] یہاں شاہ صاحبؒ نے جمہورِ مسلمین کے اتفاقِ آرا دربارۂ خلیفۂ اسلام کو جو اہمیت دی ہے اسے نظر انداز نہ کرنا چاہیے۔ اسی اہمیت کا اقتضا یہ ہے کہ حکومتِ الٰہیہ کا وہی خارجی ڈھانچہ قابلِ ترجیح ہے جس کے اندر جمہورِ مسلمین کی آرا کو دبانے کی جگہ ابھارنے کے سامان ہوں اور جس میں پراگندگیِ افکار کے مقابلہ میں مرکزیتِ افکار کا زیادہ امکان ہو۔ اس کے خلاف کسی دوسری نوعیت کا خارجی ڈھانچہ جس میں امیر یا خلیفہ کے لیے رائے عامہ سے بے نیاز رہنے کی زیادہ گنجائش ہے، خلافتِ راشدہ کے حقیقی مدعا کے لیے سود مند نہیں ہے اور ایسے ڈھانچہ میں جو خلافت برسرِ عمل ہو گی وہ پہلے تو خلافتِ غیر منتظمہ کی شکل اختیار کرے گی اور پھر خلافتِ مفتونہ کی۔ (ن۔ص)

© rasailojaraid.com

ثانی الذکر صورت میں خلیفۂ راشد کے ہوتے ہوئے شیرازۂ خلافت میں جو پراگندگی پائی جاتی ہے وہ اپنی ماہیت کے اعتبار سے کچھ ویسی ہی ہوتی ہے جیسے کسی رسول کی دعوت حق کے باوجود لوگوں میں ہدایت کا ظہور نہ ہو یا کم ہو۔ مثلاً حضرت نوح علیہ السلام اور ان کی قوم کا معاملہ لیجیے کہ سالہا سال کی سعیِ ہدایت کے باوجود تھوڑے سے نفوس کے سوا کسی نے ان کی دعوت قبول نہیں کی۔ لیکن لوگوں کے دعوت قبول نہ کرنے سے حضرت نوح علیہ السلام کی رسالت پر کوئی حرف نہیں آتا۔ بالکل اسی طرح اگر لوگ خلافت پر متفق نہ ہو سکیں تو اس سے خلیفۂ راشد کی حیثیت پر کوئی حرف نہیں آتا۔ پس خلافتِ غیر منتظمہ کو اگر خلیفۂ راشد کی موجودگی کے پہلو سے دیکھا جائے تو وہ خلافتِ راشدہ ہے۔ لیکن اگر اہلِ اسلام کے غیر متحد و غیر منظم ہونے کا پہلو رکھا جائے تو خلافتِ راشدہ نہیں ہے۔ چنانچہ وہ پیشینگوئی جو حدیث "الخلافة بعدی ثلاثون سنة" (خلافت میرے بعد تیس سال تک رہے گی) میں وارد ہے پہلے نقطۂ نظر کے مطابق ہے۔ اور دوسری طرف جو احادیث حضرت ذی النورین رضی اللہ عنہ پر خلافت کے ختم ہو جانے کی خبر دیتی ہیں وہ دوسرے نقطۂ نظر کے ماتحت ہیں، مثلاً ابو بکر ثقفی سے روایت ہے:-

ان رجلا قال لرسول اللہ صلعم رأیت کان میزانا نزل من السماء فوزنت انت و ابوبکر فرجحت انت، ووزن ابوبکر و عمر فرجح ابوبکر ووزن عمر و عثمان فرجح عمر، ثم رفع المیزان۔ فاستاء لہا رسول اللہ صلعم، فقال خلافة نبوة ثم یؤتی اللہ الملک من یشاء

ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میں نے (خواب میں) دیکھا کہ گویا آسمان سے ایک ترازو اتری، تو آپ اور حضرت ابوبکرؓ اس میں تولے گئے تو آپ کا پلہ بھاری رہا۔ پھر حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ تولے گئے تو حضرت ابوبکر کا پلڑا جھک گیا۔ پھر حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ تولے گئے تو حضرت عمر وزنی نکلے۔ اس کے بعد ترازو اٹھالی گئی۔ اس پر آنحضور قدرے کبیدہ خاطر ہوئے اور (بطور تاویل) فرمایا یہ خلافت نبوت ہے۔ اس کے بعد اللہ جسے چاہے گا ملک دے دیگا۔

پھر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:-

"اری اللیلة رجل صالح کان ابوبکر نیط برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ونیط عمر بابی بکر ونیط عثمان بعمر۔ قال جابر فلما قمنا من عند رسول اللہ صلعم، قلنا اما الرجل الصالح فرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واما نوط بعضہم ببعض فہم ولاة ہذا الامر الذی بعث اللہ بہ نبیہ صلعم

ایک مرد صالح کو خواب میں دکھایا گیا کہ حضرت ابوبکرؓ رسول اللہ صلعم کے ساتھ لٹکے ہوئے ہیں اور حضرت عمرؓ حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ اور حضرت عثمانؓ حضرت عمرؓ کے ساتھ۔ جابرؓ نے کہا جب ہم رسول کی مجلس سے اٹھے تو ہم نے کہا کہ وہ مرد صالح تو نبی صلعم ہیں۔ رہا ان حضرات کا ایک دوسرے سے لٹکنا تو یہ اس خلافت کے حاملین ہیں جسے لے کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے۔"

خلافت منتظمہ کی دو قسمیں

خود خلافت منتظمہ کی بھی دو حالتیں ہیں۔ کبھی تو خلیفۂ راشد کی عظمت لوگوں کے مختلف گروہوں کے نزدیک مسلّم اور ایسی زبان زد خاص و عام ہو جاتی ہے کہ نہ کسی کو اس کے تسلط سے کوئی عار لاحق ہوتی ہے اور نہ کسی کو اس کے خلاف قیل و قال کی کوئی گنجائش ملتی ہے۔ اس نوعیت کی خلافت کو "خلافت محفوظ" کہتے ہیں۔ کبھی یہ ہوتا ہے کہ بعض لوگوں کو خلیفہ سے کوئی وجہ شکایت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ اس پر نکتہ چینی کرنے لگتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کی حفاظت و نصرت کی وجہ سے ان کی فتنہ انگیزی بغاوت کی حد

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تک نہیں پہنچتی یعنی دلوں کی کدورت، انقطاعِ بیعت پر منتج نہیں ہوتی اور نظم خلافت بظاہر خلیفہ کی مرضی کے مطابق چلتا رہتا ہے، چاہے اس کے احکام بعض لوگوں کے دلوں پر گراں ہی کیوں نہ گذریں۔ اس نوعیت کی خلافت "خلافتِ مفتونہ" کہلاتی ہے۔ اس طرح خلافتِ منتظمہ کی بھی دو قسمیں ہوگئیں:-

۱۔ "خلافتِ محفوظہ"، مثلاً خلافتِ شیخینؓ۔

۲۔ خلافتِ مفتونہ، مثلاً خلافت ذی النورینؓ۔

ان میں سے خلافتِ محفوظہ جمہور بنی آدم بلکہ اس پوری دنیا کے لیے نعمت عظمیٰ اور سعادت کبریٰ کا حکم رکھتی اور اس صورت میں خلافتِ راشدہ ہر پہلو سے موجود رہتی ہے، وجود خلیفۂ راشد کے اعتبار سے بھی، ظاہری نظم ملت کے لحاظ سے بھی اور لوگوں کے مطمئن و مطیع ہونے کے پہلو سے بھی۔ لیکن خلافتِ مفتونہ کا معاملہ اس کے خلاف ہے۔ بلاشبہ اس میں خلیفۂ راشد موجود ہوتا ہے اور عوام کے مختلف طبقات میں بظاہر نظم بھی کارفرما ہے، مگر اہل زمانہ کی بے اطمینانی کے پہلو سے دیکھا جائے تو اصولاً یہ شے مفقود کے حکم میں ہے۔ اسی بنا پر بعض حدیثوں میں اشارہ ہے کہ خلافت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ختم ہوگی۔ مثلاً نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

بینا انا نائم رأیتنی فی قلیب علیها دلو فنزعت منها ما شاء الله، ثم اخذها ابن ابی قحافه، فنزع منها ذنوبا او ذنوبین وفی نزعه ضعف، والله یغفر له ضعفه، ثم اخذها ابن الخطاب عن ید ابی بکر. فاستحالت فی یده غربا فلم ار عبقریا یفری فریه حتی روی الناس وضربوا بعطن.

میں سو رہا تھا کہ میں نے اپنے آپ کو ایک کنوئیں پر دیکھا جس پر ایک ڈول رکھا ہوا ہے۔ سو میں نے حسب رضائے الٰہی پانی نکالا، پھر ڈول ابن ابی قحافہ نے لیا اور اس میں سے ایک یا دو ڈول کھینچے اور ان کے کھینچنے میں کمزوری کی تھی، خدا ان کی اس کمزوری سے درگذر کرے۔ پھر ڈول ابی بکرؓ کے ہاتھ سے ابن الخطابؓ نے لے لیا اور ان کے ہاتھوں میں جاکر اس نے چرس کی شکل اختیار کرلی، جسے انھوں نے اس عمدگی سے کھینچا کہ کوئی پہلوان کیا کھینچے گا، یہاں تک کہ لوگوں نے سیراب ہوکر ڈیرے ڈال دیے۔

مگر ان مختلف صورتوں میں خلفائے راشدین کے درمیان جو فرقِ مراتب خلافت کے انتشار و انتظام کے پہلو سے پایا جاتا ہے وہ عارضی ہے۔ اس کو اصل منصب خلافت سے کوئی تعلق نہیں، جس طرح حضرات انبیائے کرام میں جو فرق مراتب ظہور ہدایت کی کمی بیشی کے اعتبار سے ہے، اس کو منصب رسالت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ نبی ہر حال نبی ہے اور خلیفۂ راشد ہر حال خلیفۂ راشد ہے۔

اب یہاں چند حقائق مطلق خلیفۂ راشد کی نسبت بیان کیے جاتے ہیں۔

اصطلاح خلیفۂ راشد کا اطلاق خلیفۂ راشد سے مراد وہ شخص ہے جو منصب امامت (نیابت انبیا) پر فائز ہو اور اس سے سیاست الٰہیانی کے تمام مطالبات پورے ہوں۔ یہ صفت جس شخص میں بھی پائی جائے وہ خلیفۂ برحق ہے، خواہ وہ ماضی میں ظاہر ہو یا مستقبل میں۔ اوائل امت میں نمودار ہو یا اواخر امت میں، فاطمی الحسب ہو یا ہاشمی النسب، قصوی الاصل ہو یا قریشی النسل۔

یہ وجہ کا نہ کہنا چاہیے کہ لفظ "خلیفہ" (یا خلیفۂ راشد) بمنزلہ "خلیل اللہ"، "کلیم اللہ"، "روح اللہ"، "حبیب اللہ"، "صدیق اکبر"، "فاروق اعظم"، "ذی النورین"، "مرتضیٰ"، "مجتبیٰ"، "سید الشہدا" وغیرہ کے ہے۔ یہ سارے الفاظ مخصوص القاب ہیں، جن سے ہر لقب کسی نہ کسی خاص دینی برگزیدہ ہستی کے لیے مخصوص ہے اور اس کے اطلاق سے وہی خاص ہستی مقصود ہوتی ہے۔ اسی بات کو ایک

© rasailojaraid.com

دوسرے انداز میں یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ "خلفائے راشدین" کی اصطلاح خلفائے اربعہ (رضوان اللہ علیہم اجمعین) کے لیے ہرگز مخصوص نہیں ہے۔ بلکہ اس لقب کو ویسا ہی ایک لقب سمجھنا چاہیے جیسے "ولی اللہ"، "مجتہد"، "عالم"، "زاہد"، "فقیہہ"، "متکلم"، "حافظ"، "بادشاہ"، "امیر"، "وزیر" وغیرہ القاب ہیں۔ ان القاب میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جس کے اطلاق سے ایک ہی شخص متعین مراد لیا جائے اور خاص اسی کی کسی صفت کی طرف ذہن منتقل ہوسکے۔ یہ بات نہیں، بلکہ ان کا اطلاق جس وصف پر ہوتا ہے اس سے جو بھی متصف ہوگا، اسی کو ان میں سے کوئی لقب دیا جاسکے گا۔

مختصر یہ کہ جیسے کبھی دریائے رحمت جوش میں آیا تو کسی امام ہدایت (یعنی نبی) کا ظہور ہوگیا۔ اسی طرح جب بھی اللہ کا کمال بندہ نوازی بروئے کار آتا ہے تو کسی امام برحق کو تخت خلافت پر جلوہ گر کردیتا ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ اسے اپنے وقت کا خلیفۂ راشد نہ قرار دیا جائے۔ حدیث کی پیشینگوئی اس دعویٰ کی تردید نہیں کرتی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلافت راشدہ فقط تیس سال تک رہے گی اور اس کے بعد سلطنت کا دور آجائے گا۔ کیونکہ درحقیقت اس پیشینگوئی کا مدعا صرف اس قدر ہے کہ خلافت راشدہ بر سبیل اتصال و تواتر تیس سال تک رہے گی، یہ نہیں کہ قیام خلافت صرف اتنے ہی عرصہ کے لیے خاص ہے، بس اس کے بعد ختم۔ دوسرے لفظوں میں حدیث مذکورہ سے صرف اتنی بات اخذ ہوتی ہے کہ خلافت راشدہ کا سلسلہ تیس سال گذرنے کے بعد منقطع ہوجائے گا، مگر یہ بات اخذ نہیں ہوتی کہ اس انقطاع کے بعد ابدالآباد تک اس کا لوٹنا ممکن نہیں ہے۔ ذیل کی حدیث دورِ خلافت راشدہ کے لوٹنے پر صریحاً دلالت کرتی ہے۔

تکون النبوۃ فیکم ما شاء اللہ ان تکون، ثم یرفعہا اللہ تعالیٰ، ثم تکون خلافۃ علیٰ منہاج النبوۃ ما شاء اللہ ان تکون، ثم یرفعہا اللہ تعالیٰ ثم یکون ملکا عاضا فیکون ما شاء اللہ ان یکون ثم یرفعہا اللہ تعالیٰ، ثم تکون ملکا جبریۃ فیکون ما شاء اللہ ان یکون ثم یرفعہا اللہ تعالیٰ۔ ثم تکون خلافۃ علیٰ منہاج النبوۃ ——— ثم سکت!

جب تک اللہ چاہے گا، دورِ نبوت تم میں رہے گا، پھر اللہ اسے اٹھا لے گا پھر جب تک اللہ چاہے گا، خلافت علیٰ منہاج النبوت کا دور رہے گا، پھر اللہ اسے بھی اٹھا لے گا۔ پھر بادشاہی کا دور آئے گا اور اللہ جب تک چاہے گا وہ رہے گا، آخر وہ بھی اٹھا لیا جائے گا۔ پھر ظلم کی حکومت آئے گی اور رہے گی جب تک اللہ چاہے گا۔ پھر وہ بھی اٹھالی جائے گی اور اس کے بعد پھر خلافت علیٰ منہاج النبوت کا دور آئے گا ——— یہ کہہ کر آنحضور نے سکوت فرمایا۔

یہی نہیں، بلکہ یہ بات بھی ثابت ہے کہ حضرت مہدی علیہ السلام کی خلافت بہترین قسم خلافت، یعنی "خلافتِ منتظمہ" محفوظ ہوگی۔ انکی توصیف میں حدیث نبوی ؐ ناطق ہے:-

لو لم یبق من الدنیا الا یوم لطول اللہ حتی یبعث اللہ فیہ رجلا من اہل بیتی یواطئ اسمہ اسمی واسم ابیہ اسم ابی، یملأ الارض قسطا وعدلا کما ملئت ظلما وجورا

اگر دنیا میں سے ایک ہی دن باقی رہ جائے تو اللہ اسے دراز کرے گا یہاں تک کہ اس میں میرے اہل بیت میں سے ایک آدمی کو اٹھائے گا جس کا نام میرے نام پر اور جس کے باپ کا نام میرے باپ کے نام پر ہوگا۔ وہ زمین کو انصاف و عدل سے ویسے ہی بھر دے گا جیسے وہ ظلم و جور سے بھر چکی ہوگی۔

پھر:-

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اتاہ ابدال الشام وعصائب اھل العراق فیبایعونہ — شام کے ابدال و عراق کی جماعتیں اس کے پاس آئیں گی اور اس کے ہاتھ پر بیعت کریں گی۔

نیز یہ کہ :-

ویعمل فی الناس بسنۃ نبیھم ویلقی الاسلام بجرانہ فی الارض — وہ لوگوں میں ان کے نبی کے طریقے پر عمل کرے گا اور زمین میں اسلام مستحکم کرے گا۔

مزید براں :-

یرضی عنہ ساکن السماء وساکن الارض لاتدع السماء من قطرھا شیئاً الا صبتہ مدراراً ولا تدع الارض من نباتھا شیئاً الا اخرجتہ حتی یتمنی الاحیاء الاموات — آسمان والے بھی اس سے راضی ہوں گے اور زمین والے بھی۔ آسمان بادلوں میں سے کچھ روک نہیں رکھے گا، بلکہ سب کچھ پوری طرح لنڈھا دیگا اور زمین بھی نباتات میں سے کچھ نہ روک رکھے گی، بلکہ سب کچھ اگل دے گی، حتیٰ کہ زندے مردوں کی تمنا کریں گے۔

یہ بھی کہ :-

المھدی علیہ السلام یشبہ فی الخلق — مہدی علیہ السلام صورت میں آنحضورؐ سے مشابہ ہوں گے۔

یہ جس امام برحق اور جس دورِ رحمت کی بشارت احادیث میں دی گئی ہے اسے اگر آنا ہے تو پھر اس امر میں کیا شک رہ گیا کہ خلافت راشدہ انقطاع کے بعد لوٹ سکتی ہے [۱]

ب۔ **ایک غلط فہمی کا ازالہ** یہ خیال بھی نہ کرنا چاہیے کہ خلافت راشدہ کے فقط دو ہی ظہور ہیں، ایک وہی دورِ خلافت راشدہ جو اوائل امت میں گذرا یعنی خلفائے اربعہ کا دور اور دوسرا اواخر امت میں خلافتِ مہدی کا دور ـــــ اور ان دو دوروں کے درمیان پورا زمانہ تعطل کا ہے [۲] کہ اس میں کبھی بھی خلافت راشدہ کو ظاہر نہیں ہونا ہے۔ بخلاف اس شبہ کے اکثر تابعین نے حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کی خلافت کو خلافت راشدہ کے زیرِ عنوان شمار کیا ہے، بلکہ ان میں سے بعض نے تو عود خلافت راشدہ والی خبر (حدیث مذکورۃ "تکون النبوۃ فیکم" الخ) کو حضرتِ موصوف کی خلافت کے ظہور ہی پر منطبق کیا ہے۔ مثلاً حضرت حبیب [۳] نے اسی حدیث کو نقل کرکے اس کے فٹ نوٹ میں یہ خوش خبری لکھ کر حضرت عمر بن عبد العزیز کو بھیجی کہ :-

ارجوا ان تکون امیر المومنین بعد الملک العاض والجبریۃ ـــــ فسر بہ واعجبہ! — مجھے امید ہے کہ آپ اس کٹ اور استبدادی حکومت کے بعد امیر المومنین (خلیفۂ راشد) ہوں گے۔ (اس سے حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نہایت خوش ہوئے)

امیر المومنین موصوف نے اس بشارت کو قبول کیا اور یہ کہہ کر روانہ کر دیا کہ یہ حدیث خلافتِ مہدی کی طرف اشارہ کرتی ہے، تم کیوں اسے دوسروں کی خلافت پر محمول کرتے ہو [۴]

---

[۱] اس سلسلہ کی پیشگوئیوں میں آمیزشوں کا بہت قوی شبہ ہے، مگر ان کا مرکزی مضمون بجائے خود صحیح یعنی نظامِ حق کے دوبارہ قیام کی خبر۔ (ن۔ ص) [۲] یہی غلط فہمی آج بھی امت کے ناکارہ عناصر کے لیے سہولت پسندی کی ٹٹی بن گئی ہے۔ ان عناصر نے دعوتِ حق کا فریضہ ادا نہ کرنے کی گویا قسم کھائی ہے اور ان کا استدلال یہی ہے کہ مہدیؑ کی بعثت سے پہلے حق کے قیام کا کوئی امکان نہیں۔ (ن۔ ص) [۳] یعنی شاہ صاحب یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ حدیث مورد بالا (تکون النبوۃ) المہدی کے لیے مخصوص نہیں ہے بلکہ اس کا اطلاق اکثر تابعین کے خیال کے مطابق دوسروں پر بھی ہو سکتا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہمارے مدعا پر ایک اور حدیث نبوی (مسلم) شاہد ہے کہ :-

اذا رأیتم الرایات السود قد جاءت من قبل خراسان فاتوھا ولو حبوا علی الثلج فان فیھا خلیفۃ اللہ المھدی

جب تم خراسان کی طرف سے کالی نشانیاں آتی دیکھو تو وہاں پہنچو، چاہے تمھیں برف کے اوپر گھسٹ کر ہی جانا پڑے، کیونکہ وہاں مہدی خلیفۃ اللہ ہوگا۔

بات صاف ہے کہ یہ مہدی مہدیٔ موعود کے علاوہ ہے، کیونکہ مہدیٔ موعود کا ظہور مدینہ منورہ سے ہونا ہے، نہ کہ خراسان سے نیز یہ بھی ثابت ہے کہ یہ دوسرا مہدی بھی ہوگا خلیفۃ اللہ ہی۔ کیونکہ تمام مسلمانوں کو اس کی اعانت و رفاقت پر مامور کیا گیا ہے۔

ایک اور خبر نبوی بھی ملاحظہ ہو :-

یخرج رجل من وراء النھر یقال لہ الحارث حراث علی مقدمۃ رجل یقال لہ منصور، یمکن لآل محمد کما مکنت قریش لرسول اللہ۔ وجب علی کل مسلم نصرہ[1]

ماوراء النہر سے ایک شخص نکلے گا جسے "حارث حراث" کہیں گے اور منصور نامی شخص اس کا پیش رو ہوگا۔ اسے آل محمد پر قابو دے دیا جائے گا جیسے رسول اللہ کو قریش پر قابو دیا گیا ہے۔ اس کی مدد کرنا ہر مسلمان پر واجب ہے۔

واضح رہے کہ اہل بیت میں سے یہ بزرگ جن کا مؤید حارث بتایا گیا ہے، مہدیٔ موعود کے علاوہ ہیں، کیونکہ مہدیٔ موعود کی تائید تو سب سے پہلے لشکر عرب کرے گا، نہ کہ ماوراء النہر کی فوجوں کا اجتماع[2]

اب اس امر میں کیا شک رہ جاتا ہے کہ خلافتِ راشدہ کے اوائلی اور اواخری دو ادوار کے علاوہ اور ادوار بھی ہو سکتے ہیں۔ خلافتِ راشدہ اور مملکتِ ظاہرہ کا ادل بدل اس طرح ہوتا رہتا ہے، جیسے عام دنیوی نظاموں میں نظامِ عادلانہ اور نظامِ جابرانہ کا ادل بدل ہوتا ہے کہ کبھی یہ غالب ہے اور کبھی وہ متسلط۔ یونہی پہلے خلافت راشدہ کا ایک دور آتا ہے اور پھر ایک زمانہ مملکتِ ظاہرہ[3] کو حاصل ہوتا ہے۔ خلافت کی ان دو قسموں کا یہ ہیر پھیر بالکل گردشِ لیل و نہار کی مانند ہے کہ رات کی تاریکیوں کا سینہ چیر کر دن برآمد ہوتا ہے اور نور کے دریا بہا کر پھر انھیں تاریکیوں میں جذب ہو جاتا ہے، پھر ابھرتا ہے اور پھر ڈوب جاتا ہے اور یہ سلسلہ یونہی جاری رہتا ہے۔ پس کوئی وجہ نہیں کہ مسلمان کسی بھی زمانہ میں نعمت الٰہی کے نزول سے ناامید ہوں اور خلافتِ راشدہ کے ظہور کو

---

[1] معلوم نہیں کہ شاہ صاحب نے اپنے دعاوی کے استدلال کا دار و مدار پیشگوئیوں والی کمزور روایات پر کیوں جا رکھا ہے جب کہ پورا قرآن خود اس دعوت پر مبنی ہے کہ خدا کے قانون کو نافذ کرنے والا خلافتِ راشدہ کے سوا اور کوئی سیاسی اقتدار انسانوں کے لیے قابل قبول نہیں ہے۔ چاہے کوئی سا ملک ہو اور کوئی سا زمانہ، اور مسلمانوں کا کام یہی ہے کہ اگر خلافتِ حقہ کا نظام درہم برہم ہو جائے تو اسے از سر نو قائم کرنے کی کوشش میں لگ جائیں۔

[2] یہ پیشگوئیاں جن میں اشخاص اور مقامات کا تعین حد درجہ واضح ہے، انھیں قابل اعتماد قرار نہیں دیا جا سکتا، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشگوئیوں کا مزاج یہ نہیں ہوتا۔ ان میں بالعموم آنے والے واقعات یا اشخاص کی دھندلی نشاندہی ہوتی ہے

یہ کھلی کھلی پیشگوئیاں دورِ فتنہ میں سیاسی اغراض کے لیے بددیانت دگرگنی یا تو گھڑی ہیں یا رسالت مآب کی پیشگوئیوں میں نمایاں علامات گھسیڑ کر انھیں اپنے ممدوحین پر چسپاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ (ن عمی)

[3] "مملکتِ ظاہرہ" شاہ صاحب کی خاص اصطلاح ہے جس کی تفصیل تو آئندہ ابواب میں آئے گی۔ یہاں مختصراً یہ سمجھ لیا جائے کہ شاہ صاحب اس اصطلاح سے اس نظام سیاست کو مراد لیتے ہیں جو "اسلامی" بھی ہو اور "اسلام" سے دور بھی ہو جائے۔ (ن عمی)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ناممکن تصور کریں۔ اس نعمت کی بھیک بہرحال میں مجیب الدعوات سے مانگنی چاہیے اور اپنی صدائے گدایانہ کے نتیجہ خیز ہونے کی امید لگائے رکھنی چاہیے۔ ہر لمحہ اور ہر خلیفۂ راشد کے انتظار میں کٹے اور ہر قرن کے متعلق یہی توقع رہے کہ شاید اسی میں خدا کی قسمت کا ملہ ظہور پائے اور شاید اسی میں خلافتِ ربانی کا آفتاب طلوع کرے۔[1]

خلیفۂ راشد کی حقیقت[2] خلیفۂ راشد دنیا میں اللہ تعالیٰ کا نمائندہ اور انبیاء کی مسند پر بیٹھنے کی وجہ سے گویا انہی کے گروہ کا ایک فرد ہوتا ہے۔ اس کی ذات دینِ حق کی ترقی کا وسیلہ ہوتی ہے۔[3] وہ ملائکہ مقربین کا ہمسایہ بلکہ عالمِ امکان کی روحِ رواں ہوتا ہے اور ساری کائنات اس پر فخر کرتی ہے۔ وہ افرادِ انسانی کا سرتاج اور اربابِ[4] عرفاں کا سرخیل ہوتا ہے۔ اس کے دل پر تجلیاتِ ربانی کا نزول[5] ہوتا ہے۔ اس کا اقبال جلالِ یزدانی کا پرتو اور اس کی محبوبیت جمالِ ربانی کا عکس ہوتی ہے۔ اس کا قہر تیغِ قضا ہے تو اس کی مہر سرچشمۂ عطا۔ اس سے لڑنا تقدیر سے لڑنا اور اس کی مخالفت خود ربِ قدیر کی مخالفت ہے۔[6] اس حیثیت کے پیشِ نظر اگر کسی صاحبِ کمالات نے اس کی خدمت[7] و اطاعت میں کمال نہ دکھایا تو اس کے کمالات بالکل رائگاں ہیں اور کسی صاحبِ علم کے علوم اگر اسی کی عظمت و کرامت کی شرح نہ کر سکے تو وہ قطعاً بے کار ہیں۔ پھر اگر کسی نے کمالات کے غرور میں اگر اس کی ہم سری[8] کی تو گویا مشارکتِ حق تعالیٰ

[1] یہ سطور شاید آج کل کے قنوطی علماء و خواص کے لیے سرچشمہ بصیرت ثابت ہوں۔ ان کی طرف سے بالعموم دعوتِ حق کے جواب میں یہ اعتراض پیش کیا جاتا ہے کہ نظامِ حق کا قیام موجودہ دور میں ممکن نہیں ہے، بلکہ اس دور کے لیے سلطنتِ کفر مقدر ہو چکی ہے۔ یوں تو نظامِ اسلامی کے حق ماننے کے بعد کسی کے لیے چارہ نہیں رہتا کہ وہ اس کے قیام کے لیے جد و جہد نہ کرے، لیکن راہِ انحراف ڈھونڈ نکالنے میں جن لوگوں کو مہارت حاصل ہے، انھوں نے تبرت کی دو ایک پیشنگوئیوں کی ڈھال پر پورے قرآن کی مرکزی دعوت کے وار کو روک دکھایا ہے۔ شاہ صاحب ان سطور کے ذریعہ اسی ڈھال کو توڑ دینا چاہتے ہیں اور مسلمانوں کو نظمِ حق کے قیام کے لیے اکسا دینا چاہتے ہیں۔ (ن۔ص)

[2] خلیفۂ راشد کی دینی حیثیت کو متعین کرنے سے مقصود یہ ہے کہ مسلمان ٹھیک ٹھیک جان لیں کہ اس سے کس طور سے معاملہ کرنا صحیح ہوگا، اور کس طور سے غلط۔ (ن۔ص)

[3] دینِ حق کے نفاذ سے نظامِ تمدنِ انسانی پورے ہنگامۂ کائنات سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے اور انسان کے تشریعی و طبعی دائرہ ہائے حیات میں کوئی تضاد اور کوئی تصادم باقی نہیں رہتا۔ پس دینِ حق کا حفظ و قیام جس ہستی کا مرہونِ منت ہوتا ہے اس سے کائنات کا ایک ایک ذرہ طمانیت حاصل کرتا ہے۔ (ن۔ص)

[4] مراد یہ کہ اسلام کے اجتماعی نظم اور اس کی روح کو غالب کرنے اور اسے پرورش دینے کا عظیم الشان فریضہ جس نے اپنے ذمہ لیا ہو، تقویٰ و عرفان کی اونچی سے اونچی منزل اس کے قدم چومتی ہے۔ یہی منتہا ہے عبودیت و عرفان کا۔ (ن۔ص)

[5] تجلیاتِ ربانی کے مفہوم میں وہ کیفیاتِ یقین و اذعان، وہ بصیرتِ دینی اور وہ صلاحیتِ امتیازِ حق و باطل ہے جو دینِ حق کے سچے خادموں کے لیے مخصوص ہیں۔ (ن۔ص)

[6] ان جملوں کا منشا واضح ہے کہ خلیفۂ راشد کا اقتدار چنگیز و ہلاکو کے اقتدار کی طرح رضائے الٰہی سے ہٹا ہوا نہیں ہے۔ وہ خدا کی حکومت کا ناظم ہے۔ پس اس ناظم سے جو الجھا اس نے درحقیقت خدا ہی سے الجھنے کی حماقت کی۔ (ن۔ص)

[7] یہاں شخصی و ذاتی خدمت و اطاعت کا ذکر نہیں ہے۔ شخصی طور پر تو خلیفہ یا امیر اگر کوئی چیز کسی سے طلب کرتا ہے یا کسی کی اعانت چاہتا ہے تو اس کی حیثیت محض ایک "سائل" کی ہے۔ (ن۔ص)

[8] قانونی و اخلاقی ہم سری کی نفی نہیں کی جا رہی، بلکہ سیاسی حیثیت میں اس کی ہم سری کو جرم قرار دیا گیا ہے، یعنی بحیثیت صاحبِ امر اس کو جو خاص مرتبہ نظامِ دینی میں حاصل ہے اس میں کسی قسم کی حصہ داری کا ادعا جائز نہیں ہے۔ اس مرتبۂ خاص کی توضیح شاہ صاحب نے آئندہ سطور میں نہایت اچھی طرح کر دی ہے۔ (ن۔ص)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

راہ میں قدم رکھا۔ اہل کمال کی تو پہچان ہی یہی ہے کہ وہ خلیفۂ راشد کی خدمت و اطاعت میں اپنی پوری قوتیں صرف کردیں اور اس کی برابری کے دعویٰ سے دستبردار ہو جائیں، کیونکہ وہ صحیح معنوں میں حضور رسالتمآبؐ کا جانشین ہے۔

زیادہ صاف لفظوں میں اگر کہنا چاہیں تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ خلیفۂ راشد "نبی حکمی" (نبی مجازی) ہوتا ہے، یعنی اگرچہ وہ فی الحقیقت نبوت و رسالت کو نہیں پہنچتا لیکن منصب خلافت پر متمکن ہونے کی وجہ سے انبیاء اللہ سے اس کو بعض امور میں مماثلتیں حاصل ہیں۔[۱] ان مماثلتوں کا مفصل بیان تو انشاء اللہ آئندہ ابواب میں آئے گا۔ البتہ یہاں ان میں سے بطور نمونہ دو چار چیزوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

۱۔ اطاعتِ خلیفہ پر نجات اخروی کا انحصار :— خدا کے رسولوں پر ایمان لائے بغیر کوئی شخص معرفت الٰہی اور تہذیب نفس میں کمال حاصل کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور کیوں نہ لگا دے۔ نجات اخروی کا حقدار نہیں ہو سکتا۔ اور کوئی طاقت خداوند جبار کے غضب اور اس کی دہکتی ہوئی دوزخ سے اسے بچا نہیں سکتی۔ بالکل اسی طرح عبادات شرعیہ اور طاعات دینیہ کی بجا آوری میں کوئی شخص کتنا ہی خون پسینہ ایک کر دے، اور اسلام کے امتثالِ امر میں کتنی ہی جدوجہد کا مظاہرہ کرے، امام وقت کی امامت کو صاف صاف تسلیم کیے بغیر اور اس کی اطاعت کے لیے گردن جھکائے بغیر خدائے قہار کی دار و گیر سے مخلصی نہیں پا سکتا۔ وہ زہد و تقدس اور وہ طاعتیں اور عبادتیں جو خلیفۂ راشد کی اطاعت سے باہر رہ کر سرانجام دی جائیں، آخرت میں رائی کے دانے جتنا وزن بھی نہیں پا سکتیں۔[۲]

ملاحظہ ہو حدیث :-

من لم یعرف امام زمانہ فقد مات میتۃ جاھلیۃ	جس نے اپنے وقت کے امام کو نہ مانا وہ جاہلیت کی موت مرا۔

پھر :-

صلوا خمسکم وصوموا شھرکم وادوا زکوۃ اموالکم واطیعوا اذا امرکم تدخلوا جنۃ ربکم	پانچ وقت کی نمازیں ادا کرو، رمضان کے روزے رکھو، اپنے مالوں کی زکوۃ دو، اپنے امراء کی اطاعت کرو، اپنے رب کی جنت میں داخل ہوگے۔

دوسری حدیث ہے :-

---

[۱] ان الفاظ سے کوئی غلط فہمی نہ ہو۔ ان کا مفہوم یہ ہے کہ نبی کی حیثیت نبوت و رسالت (یعنی مورد الہام ہونا، احکام الٰہی کا مستند و عملی شارح ہونا اور امت کے لیے دائمی اسوہ ہونا) میں تو خلفاء شریک نہیں ہیں مگر اس کی حیثیتِ امارت (یعنی احکام الٰہی کو بندوں پر نافذ کرنے اور رضائے الٰہی کے مطابق سیاستِ ایمانی کو چلانے کا منصب) اس کے مخلص جانشینوں کی طرف منتقل ہو جاتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ نبی کی امارت اور خلیفہ کی امارت میں فرق ہوتا ہے مگر اس فرق کے باوجود دونوں کے منصب امامت میں بہت زیادہ مماثلت پائی جاتی ہے اور دونوں قسم کی امارتوں پر اکثر حالتوں میں ایک ہی حکم لگایا جاتا ہے۔ (ن۔ص)

[۲] اسلام ایک اجتماعی دین ہے۔ اس وجہ سے یہ کسی کو اپنے نظم اجتماعی سے علیحدہ ہو کر اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنانے کی اجازت نہیں دیتا۔ اس نقطۂ نظر سے کوئی پرزہ خواہ کتنی ہی اچھی دھات سے ڈھالا گیا ہو اور کتنی ہی صفائی سے بنایا گیا ہو اور کتنا ہی خوبی سے اسے صیقل کیا گیا ہو، نظام حق کی مشین میں فٹ نہ ہوا تو وہ دو کوڑی کی قیمت بھی نہیں پا سکتا بخلاف اس کے معمولی دھات کا ایک پیچ جو کچھ زیادہ صیقل زدہ بھی نہیں ہے، اگر نظم حق کی کل میں نصب ہو کر اس کے اجتماعی عمل میں اپنا حصہ ادا کر رہا ہے، سونے کے ساتھ تُلنے کا مستحق ہے (ن۔ص)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

من مات ولیس فی عنقہ بیعۃ مات میتۃ جاھلیۃ

جو شخص اس حال میں مرا کہ اس کی گردن میں (امام وقت کی) بیعت کا قلادہ نہیں تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔[1]

۲۔ احکامِ خلیفہ کی موافقت پر عبادات کی قبولیت کا مدار:۔۔۔ یہ ظاہر ہے کہ دینی عبادات اور شرعی طاعات اگر نبوت کے مطابق ہوں تو مقبول ہوتی ہیں، ورنہ مردود۔ اسی طرح جمعہ وعیدین اور حدود و تعزیرات، اور جہاد وغیرہ فرائض کی ٹھیک ٹھیک ادائیگی صرف اس صورت میں متصور ہے کہ وہ خلیفۂ راشد کے احکام کے مطابق ہوں۔ اس کے احکام سے بے نیاز ہو کر ان فرائض کو انجام دینا آخرت میں نتیجہ خیز نہیں ہے۔ آنحضور صلعم کا ارشاد ہے:۔

انما الامام جنۃ یقاتل من ورائہ ویتقی بہ

امام وقت ڈھال ہے جس کی اوٹ میں جنگ کی جاتی ہے اور جس کے ذریعے حفاظت ہوتی ہے۔

نیز فرمایا کہ:۔

الغزو غزوان فاما من ابتغی وجہ اللہ واطاع الامام وانفق الکریمۃ ویاسر الشریک واجتنب الفساد فان نومہ ونبھہ اجر کلہ واما من غزا فخرا ورئاء وسمعۃ وعصی الامام وافسد فی الارض فانہ لم یرجع بالکفاف

جہاد دو طرح کا ہوتا ہے۔ جو شخص اللہ کی خوشنودی چاہتا ہے، امیر کی اطاعت کرتا ہے، اپنا عمدہ مال خرچ کرتا ہے اور اپنے ساتھی کے ساتھ نرمی کرتا ہے اور فساد سے بچتا ہے تو اس کا سونا اور جاگنا کل کا کل اس کے لیے اجر ہے۔ جو شخص فخر، نمائش اور شہرت طلبی کے لیے جہاد کرتا ہے اور امام کی نافرمانی کرتا ہے اور زمین میں فساد کرتا ہے اس کے پلے کچھ نہیں پڑتا۔

۳۔ معاملاتِ انسانی میں حکم نفاذ:۔۔۔ نبیٔ وقت جب دو شخصوں کے درمیان کسی قسم کے معاملہ کے انعقاد کا حکم لگاتا ہے، مثلاً نکاح یا بیع وغیرہ امور ہیں، تو پھر وہ معاملہ اس حکم کی وجہ سے خود بخود منعقد ہو جاتا ہے اور پھر کسی کو اس میں چون وچرا کا حق نہیں رہتا۔ اس حقیقت کو حق جل وعلیٰ نے یوں بیان فرمایا ہے:۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُولُهُ أَن يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ

کسی مسلمان مرد اور کسی مسلمان عورت کے لیے یہ روا نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی معاملہ میں فیصلہ دے دیں، تو اپنے معاملہ میں انھیں (پھر بھی) اختیار۔۔۔

نبی کے بعد یہ سارے معاملات خلیفۂ راشد یا اس کے ماتحت قاضی کے حکم سے منعقد ہوتے ہیں۔ اس کے فیصلوں میں بھی کسی کے لیے مجال گفتگو باقی نہیں رہتی۔ جیساکہ مختلف کتب دینی اور ان کی شرحوں میں مسئلہ "قضاء القاضی ینفذ ظاہراً و باطناً" (قاضی کا فیصلہ ظاہر و باطن ہر لحاظ سے نافذ ہے) کا تذکرہ صراحۃً موجود ہے۔

۴۔ حکمِ خلیفہ کا حجت شرعی ہونا:۔۔۔ کون نہیں جانتا ہے کہ نبی کا حکم احکامِ شریعت کو ثابت کرنے میں دلیل کی حیثیت رکھتا ہے۔

[1] اس نوعیت کی روایات واحادیث کو بہت غلط طریقہ سے استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ ان کے متعلق یہ بات طے ہے کہ یہ خلیفۂ راشد یا امام برحق سے مخصوص ہیں۔ ان کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اگر امام برحق موجود نہ ہو تو ہر کس وناکس جو بھی سامنے آئے اس کے ہاتھ پر بیعت کر لو۔ (ن۔ص)

[2] یعنی جمعہ وعیدین صرف امام یا اس کے نائب مجاز کی امامت میں ادا ہوں گے، اسی طرح حدود و تعزیرات کا اجرا بھی اس کے حکم کے ماتحت ہوگا اور جنگ و صلح کے معاملات بھی اسی کے حکم سے طے پائیں گے۔ یہ جائز نہیں ہے کہ امام کے فیصلہ کے بغیر جس کا جی چاہے جنگ کے لیے نکل کھڑا ہو اور جس کا جی چاہے کسی پر الزام قائم کر کے بطور خود کوئی سزا دے دے۔ (ن۔ص)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یعنی کسی قول یا فعل میں ہزار فائدے اور نقصان نظر آئیں اور عقل لاکھ کسی امر کے حسن و قبح کو ثابت کرے، لیکن جب تک کتاب منزل اور نبیٔ مرسل کی طرف سے کوئی نص اس کے وجوب یا اس کی حرمت پر دلالت نہ کرے، اس کا فرض یا حرام ہونا شریعت میں ثابت نہیں ہو سکتا۔

بالکل ایسی ہی سیاسی معاملات سے تعلق رکھنے والے کسی قول و فعل میں کتنے ہی فوائد کیوں نہ متصور و متیقن ہوں امام وقت یا اس کے نائب کے فیصلے کے بغیر شرعاً انھیں کوئی اہمیت حاصل نہیں ہوگی اور اس قول و فعل کا وجوب ہرگز ثابت نہیں ہوگا۔ علیٰ ہذا القیاس کسی دعویٰ کی صحت و بطلان یا کسی حد و تعزیر کے ثبوت کے لیے سیکڑوں دلائل کا ہونا اور بیسیوں گواہوں کا گواہی دینا بالکل عبث ہے، جب تک کہ امام یا اس کے نائب کا حکم ان پر چسپاں ہو کر انھیں پایۂ ثبوت پر نہ پہنچا دے۔

پس جس طرح اصل احکام شریعت کو نص نبوی ثابت کرتی ہے اور ان کے ساتھ مختلف امور کے حسن و قبح پر جو عقلی استدلال کیا جاتا ہے وہ محض مخاطبین کی تسلیٔ خاطر اور مخالفین کے اعتراضات کی تردید کے لیے ہوتا ہے، اسی طرح معاہدات و معاملات اور حدود و تعزیرات کا نافذ و منعقد ہونا امام اور اس کے نائب مجاز کے حکم پر منحصر ہے۔ اس حکم کے ساتھ اگر گواہوں کی گواہی کا اظہار اور کسی صورت معاملہ کے نفع و نقصان کی تشریح ہوتی ہے تو وہ صرف متعلقین معاملہ کی تسلیٔ خاطر اور مخالفین کے الزام کو روکنے کے لیے ہوتی ہے کہ وہ کسی صورت معاملہ کو ظلم و جور پر محمول نہ کریں۔

۵۔ خلیفہ کے احکام کا نصِ مجازی ہونا: — جس طرح مجتہدین کے اجتہادات اور اربابِ قیاس کے قیاسات خدا و رسول کی نصِ قطعی کے خلاف واقع ہونے کی صورت میں پایۂ اعتبار سے گر جاتے ہیں اور اسی مخالفتِ نص کی وجہ سے عملاً ان کا اتباع نہیں کیا جاتا، اسی طرح امام اور اس کے نائب مجاز کے احکام سے متعارض ہونے کی صورت میں بھی اجتہادات و قیاسات بلاشبہ پایۂ اعتبار سے گر جاتے ہیں۔ پس دو مختلف اجتہادی و قیاسی آراء میں سے حکمِ امام جس کی تصدیق و تائید کرے گا، اس کو واجب الاذعان جاننا امت کے ہر فرد کے لیے ضروری ہے، چاہے کوئی مجتہد ہو یا مقلد، عالم ہو یا عامی، عارف ہو یا غیر عارف! کسی کو اپنے یا مجتہدین سلف کے اجتہادات اور اسی طرح اپنے یا شیوخ متقدمین کے مکاشفات کے بل پر امام برحق[1] سے معارضہ کرنا روا نہیں ہے۔ امور مذکورۃ الصدر میں جس کسی نے حکمِ امام کے خلاف کوئی دوسری راہ اپنے لیے پسند کی وہ یقیناً عند اللہ مجرم ہے اور اس کا کوئی عذر رب العلمین کے حضور میں یا انبیاء و مرسلین کی بارگاہ میں یا علمائے مجتہدین کی نگاہ میں مسموع نہیں ہے، کیونکہ یہ ایک اجماعی مسئلہ ہے اور اہل اسلام میں سے کسی کو اس میں اختلاف نہیں ہے۔

۶۔ خلیفہ کے مقرر کردہ قوانین سیاست کا "سنت" کی تعریف میں ہونا: — نبی خدا کے کسی فرمودہ کے ماتحت جزئی امور میں جو حدود و عمل مقرر کرتا ہے ان سے اسی طرح استدلال و استمساک کیا جاتا ہے، جس طرح فرمودۂ الٰہی سے۔ اسی طرح خلیفۂ راشد کتاب و سنت کی حدود میں رہتے ہوئے، جن جن سیاسی قوانین اور ریاستی ضوابط کو نافذ کرتا ہے ان سے بالکل سنت نبوی کی

---

[1] امام برحق کے اجتہادی احکام کی یہ حیثیت "عمل" کے ساتھ مخصوص ہے۔ نظری طور پر استنباطی امور میں اس سے اختلاف رائے کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً خلیفۂ برحق اول وقت پر نماز پڑھنے کا قائل ہے تو مسلمانوں کے لیے یہ لازم ہوگا کہ وہ اس کی امامت میں اول وقت ہی نماز ادا کریں، ہاں اس امر کی گنجائش رہے گی کہ کوئی شخص علمی طور پر نماز کو موخر کرنا پسند کرے۔ (ن۔ ص)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

طرح مناظرات و معاملات میں استدلال و تمسک کرنا بجا و درست ہے، کیونکہ خلیفۂ راشد کے استنباط کردہ قوانین بدعت کی تعریف میں نہیں آتے، بلکہ سنت نبوی کے دائرہ میں شمار ہوتے ہیں۔

اس مضمون پر حدیث نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) گواہ ہے:۔

انه من يعش منكم بعدي فسيرى اختلافاً كثيراً، فعليكم بسنتي وسنة الخلفاء الراشدين المهديين، تمسكوا بها وعضوا عليها بالنواجذ وإياكم ومحدثات الأمور، فإن كل محدثة بدعة وكل بدعة ضلالة

تم میں سے جو لوگ میرے بعد زندہ رہیں گے وہ بہت سے اختلافات دیکھیں گے تو تمہارے اوپر لازم ہے کہ میرے اور خلفائے راشدین کے طریقے کی پیروی کرو۔ ان کو مضبوطی سے پکڑو اور دین میں جو نئی باتیں پیدا کی گئی ہیں ان سے بچو کیونکہ ہر نئی بات جو دین میں پیدا کی گئی وہ بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اختلافات میں کسی خلیفۂ راشد کے طریقہ سے استدلال کرنا موجب ہدایت ہے اور یہ کہ خلیفۂ راشد بدعت سے بری ہے۔

۷۔ احکام خلیفۂ راشد کا متمم سنت ہونا:— حکیم مطلق نے شریعت کے اصولی احکام کو تو اپنی نازل کردہ کتاب میں بیان فرما دیا ہے لیکن ان کی فروع اور شرائط کا تعین نبی کے ذمہ کر دیا۔ مثلاً اس نے اپنی کتاب میں نماز پڑھنے اور زکوٰۃ دینے کا مجمل حکم دے دیا ہے، لیکن نماز کے باب میں اوقات اور رکعات کی تعداد اور ارکان و شرائط کی وضاحت کو، اور اسی طرح زکوٰۃ کے باب میں اموال زکوٰۃ نصاب زکوٰۃ اور شرح زکوٰۃ وغیرہ امور کے تعین کو اپنے رسول مقبول کے سپرد کر دیا۔ چنانچہ دین کا حفظ خدا کی کتاب کے اصولی احکام اور حدیث مسلسل سے ثابت ہونے والے فروعات، دونوں کے پورے مجموعہ کو گھیرے ہوئے ہے اور یہ دونوں عناصر مل کر ہی شریعت کے نظام کو مکمل کرتے ہیں۔

مگر اسی طریق سے سوچیں تو شریعت کے کتنے ہی احکام ایسے ملیں گے جن میں اختلاف احوال کی وجہ سے تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے۔ مثلاً لشکر کشی بعض اوقات رضائے الٰہی کے مطابق ہوتی ہے، بعض اوقات مخالف۔ پھر لشکر کا کسی مقام میں قیام کرنا یا اس سے کوچ کر جانا دیکھیے کہ ان میں بھی ہو سکتا ہے اور ضرر بھی۔ پس ایسی صورت میں کسی حکم کو دائمی یا غیر متغیر نہیں قرار دیا جا سکتا کون کہہ سکتا ہے کہ مطلق لشکر کشی واجب ہے یا ممنوع؟ یا کون کہہ سکتا ہے کہ لشکر کے لیے مطلقاً قیام یا کوچ حلال ہے یا حرام؟ لہٰذا ان امور میں حکم لگانا اور فیصلہ دینا امام وقت کی رائے پر چھوڑا گیا ہے اور امام کے اس طرح کے احکام اور فیصلے یقیناً احکام شرعی ہی میں شمار ہوں گے، نہ کہ رسوم عرفی میں!

پس شریعت کے مفہوم میں کتاب اللہ اور حدیث نبوی کے ساتھ امام کے یا خلیفۃ المسلمین کے احکام بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ جس طرح کتاب و سنت دین متین کے لیے اساسی حجت ہیں اسی طرح [illegible] امام [illegible] شریعت میں [illegible] کی حیثیت رکھتا ہے۔ پھر جیسے سنت کتاب کے مقابلہ میں دوسرے درجہ پر آتی ہے، ویسے ہی حکم امام کو سنت کے مقابلہ میں دوسرا درجہ حاصل ہے۔ ماخذ دین و شریعت کی صحیح ترتیب یہی ہے کہ کتاب [illegible] سنت نبوی [illegible] ہے، اور حکم امام اس کی صراحت و وضاحت کرنے والا ہے۔ اسی ترتیب کے مخالف [illegible] درجہ اول ہوا [illegible] دوسرے درجہ پر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور خلیفۃ اللہ پر کامل اعتماد رکھنا تیسرے درجہ پر: بالکل یہی ترتیب کتاب اللہ میں مذکور ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ — اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اپنے ارباب امر کی اطاعت کرو۔

اور اس آیت کی شرح فرمودۂ نبوت سے ہوتی ہے۔

علیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین المهدیین — تم پر میرے طریقہ کا اور ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کے طریقے کا اتباع لازم ہے۔

انھیں شواہد کی بنا پر علمائے امت نے امور غیر منصوصہ میں امیر کے قیاس واجتہاد کی صحت کو اطاعت کی شرط نہیں مانا ہے بلکہ اس کے مجتہدانہ فیصلوں کی پیروی بہر صورت لازم قرار دی ہے، چاہے اس کا قیاس ضعیف وناقص ہی کیوں نہ ہو۔ یعنی امام کے قیاس کو اس سے لاکھ درجہ بہتر قیاس کے بل پر بھی رد نہیں کیا جا سکتا۔ بات صاف ہے کہ مجرد قیاس کتنا ہی مستند اور کتنا ہی صحیح کیوں نہ ہو، حکم امام کے برابر وزنی نہیں ہو سکتا، کیونکہ حکم امام اصول دین میں سے ایک اصل اور دلائل شرعی میں سے ایک دلیل ہے۔ خلیفہ کی مخالفت کرنے کے لیے جو قیاس وسیلہ بنتا ہے، اس میں کتنی ہی صحت وراستی ہو، وہ ظنی چیز ہے، مگر دوسری طرف اگرچہ خلیفہ کا حکم بھی قیاس ہی سے ماخوذ ہے مگر وہ بالکل قطعی ہے۔ یہ مسئلہ ویسا ہی ہے جیسے "اجماع" کا مسئلہ ہے۔ کون نہیں جانتا کہ اجماع نظام شرعی میں ایک قطعی حجت ہے مگر غور کیجیے تو وہ بھی اپنی اکثر حالات میں حقیقت نفس الامری کے لحاظ سے فقط ایک قیاس ہے، یا ایک خبر غیر مشہور ہے اور اس وجہ سے اس کے ظنی ہونے میں کوئی کلام نہیں، مگر بہتر سے بہتر قیاس سے بھی اسے رد نہیں کیا جا سکتا۔

۸۔ حکم خلیفہ "نص حکمی" (نص مجازی) ہے:— اس کی توضیح یہ ہے کہ کتنی ہی چیزیں ایسی ہیں جن کے متعلق کتاب اللہ میں سکوت اختیار کیا گیا ہے مگر سنت نبوی انھیں حرام یا واجب قرار دیتی ہے۔ یوں ہی بہت سے امور ایسے ہیں جنھیں کتاب وسنت کی رو سے نہ حتمی طور پر حرام کہا جا سکتا ہے، نہ واجب۔ ایسے امور کی حرمت یا وجوب کو حکم امام (نص حکمی ہونے کی وجہ) متعین کر سکتا ہے۔ کیونکہ اس کا درجہ نص حقیقی سے فروتر مگر دوسرے تمام دلائل شرعی سے بلند ہے۔

۹۔ تبیین احکام کی ذمہ داری:— نبی کے امت میں ہوتے ہوئے اگر کوئی اخلاقی وسیاسی مسئلہ پیدا ہو یا مہمات دین میں سے کوئی مہم پیش نظر ہو تو اہل امت کے لیے یہ جائز نہیں رکھا گیا ہے کہ وہ اس کے تصفیہ میں کوئی مسابقت دکھائیں اور بطور خود اس پر قیل وقال کرتے پھریں۔ بارگاہ نبوت سے علیحدہ لوگوں کا مجالس مشاورت منعقد کرنا اور ان میں عقل، تدبیر، رائے اور قیاس کی ترکتازیاں دکھا کر کسی معاملہ کی حیثیت متعین کرنا اور اس پر حکم لگانا جرم ہے۔ اس کے بجائے چاہیے یہ کہ زیر نظر معاملہ میں بطور خود بالکل سکوت اختیار کریں اور اسے براہ راست حضور نبوت میں پہنچا کر اس امر کے منتظر رہیں کہ ادھر سے کیا حکم صادر ہوتا ہے اور کونسا طریق عمل متعین ہوتا ہے، کیونکہ حکم لگانا ہی نبی کا منصب ہے، امت کا کام فرماں برداری ہے۔ اس مدعا پر ذیل کی آیت روشنی ڈالتی ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَيِ اللَّهِ — اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول کے آگے سبقت کی کوشش نہ کرو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وَرَسُوْلِهٖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۔ اِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ؀

اور اللہ سے ڈرو۔ بے شک اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔

یہی حیثیت نبی کے بعد امام کی ہے اور مسلمانوں کا یہ فرض ہے کہ اجرائے احکام اور مہمات دینی کی انجام دہی کو امام کے حوالہ کر دیں اور اس کے ساتھ قیل و قال اور بحث و جدال نہ کرتے پھریں۔ امت کو امام کے ہوتے ہوئے، یہی نہیں کہ بطور خود کسی مہم میں اقدام نہیں کرنا چاہیے، بلکہ امام کے احترام کا تقاضا یہ ہے کہ زبانیں تک اس کے سامنے بے لگام نہ ہونے پائیں، اور لوگ اپنی آرا سے اس کے تصفیوں اور فیصلوں میں خلل نہ ڈالیں۔ مختصر یہ کہ تعیین احکام کے معاملہ میں کوئی شخص خلیفہ کی ہمسری کرنے کا مجاز نہیں ہے۔ قرآن بھی اس دعوی پر شاہد ہے:۔

وَاِذَا جَاءَ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ ۔ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطٰنَ اِلَّا قَلِيْلًا

اور ان کو امن یا خوف کی کوئی بات پہنچتی ہے تب اس کو مشتہر کر دیتے ہیں۔ اور اگر اس کو رسول اور ارباب امر کے سامنے پیش کرتے تو وہ لوگ اس کو جانتے جو اس پر غور کرتے اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تم شیطان کے پیچھے لگ جاتے اور کم ہی بچتے۔

خلیفۂ راشد کی حیثیت کی اس تشریح سے لازم آتا ہے کہ کاروبار خلافت کو بادشاہوں کی سیاست اور جاگیرداروں کی ریاست پر قیاس نہ کیا جائے۔ ان دنیوی اقتداروں کو اس دینی منصب سے کوئی نسبت نہیں۔ ان کی اپنی ایک حیثیت ہے اور اس کی اپنی ایک اہمیت، جن کو آپس میں گڈمڈ نہیں کرنا چاہیے۔

خلاصۂ بحث خلیفۂ راشد استعارۃً نبی کا فرزند ولی عہد ہوتا ہے اور اس کے مقابلہ میں دوسرے ائمۂ دین عام فرزندوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ سعادتمند بیٹوں کی سعادت اس میں ہوتی ہے کہ جس ادب و احترام اور جس خدمت و اطاعت کا مستحق باپ کو سمجھتے ہیں، اسی کو باپ کے جانشین ہونے والے بھائی کے مقابلہ میں بجا لائیں۔ ان کا فرض ہو کہ اسے بجائے والد شمار کرتے ہوئے اس کی برابری کی ڈینگ نہ ماریں۔ ان کے لیے مرتبۂ وزارت سے آگے قدم رکھنا نازیبا ہے۔ بالکل یہی تقاضا امامانِ ہدایت کی امامت کا ہے۔ جیسی اطاعت و اعانت پیغمبر کے مقابلہ میں کی جانی چاہیے۔ ویسی ہی خلیفۂ راشد کے مقابلہ میں بھی واجب ہے۔ ہر امام کو اپنی زمام اختیار اس کے حوالہ کر دینی چاہیے اور تمام معاملات میں اتباع امر کے لیے گردن اس کے سامنے جھکا دینی چاہیے، خواہ خلیفہ کے مقابلہ میں وہ وجاہتِ علم و فضل کی اونچی سے اونچی منزل پر پہنچا ہوا ہو اور مقاماتِ ولایت میں سے بلند ترین مقام پر اس کا قدم کیوں نہ جم چکا ہو۔ کسی شخص پر انعام و مکاشفات کی کتنی ہی بارش کیوں نہ ہو رہی ہو اور کسی کو خطاباتِ الٰہی کی کتنی ہی توجہ کیوں نہ حاصل ہو اور کسی کی چشم بصیرت پر کتنے ہی ابواب ہدایت کیوں نہ وا ہو جائیں، اور وہ ان سارے پہلوؤں میں خلیفہ کا ہم پلہ ہی کیوں نہ ہو، مقام اطاعت و اتباع سے آگے بڑھنے کا اسے حق نہیں پہنچتا۔ سیاست کبریٰ کا وارث اور خلافت عظمیٰ کا مالک بہرحال صرف خلیفۂ راشد ہی ہے۔ اسے اپنے جلیل الشان منصب کی وجہ سے انبیاء اولوالعزم سے مماثلت حاصل ہے۔ ادھر دوسرے تمام ارباب امامت کو بھی اگرچہ انبیاء ہی کے منصب ہدایت سے حصہ ملتا ہے مگر انہیں جس سرچشمہ سے یہ عہدۂ امامت ہاتھ آتا ہے، اسی سرچشمہ سے خلیفۂ راشد کی اطاعت و اعانت کا حکم بھی پہنچتا ہے۔ یہ وہی صورت ہے کہ غیر نبی ہوتے ہوئے کوئی شخص نعمت وحی سے قدرے حصہ پائے اور راہ ہدایت میں رہبری کی سعادت حاصل کرے مگر اسے جس کریم مطلق کی بارگاہ سے یہ معزز رتبہ ملتا ہے اسی کی طرف سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انبیاء و مرسلین کی فرماں برداری کا فریضہ اس پر عائد ہوتا ہے۔ اسی طرح ائمہ ہدایت کا معاملہ ہے کہ جس بادشاہ مطلق کی جانب سے انھیں منصب امامت عطا ہوتا ہے وہی انھیں خلیفۂ راشد کی اعانت پر مامور فرماتا ہے۔

خلیفۂ راشد کے ساتھ ائمہ ہدیٰ کے حسن معاملہ کی بہترین مثالیں ڈھونڈنی ہوں تو وہ صدیق اکبرؓ و فاروق اعظمؓ یا فاروق اعظمؓ و جناب علی مرتضیٰؓ یا جناب مرتضیٰ و جناب حسن مجتبیٰ کے باہمی ربط سے اخذ کی جاسکتی ہیں۔ ان حضرات نے کمالات روحانی اور فضائل نفسانی سے متصف ہونے کے باوجود اپنی زمام اختیار خلیفۂ راشد کے ہاتھوں میں دے دی تھی اور اس کی اطاعت کے لیے اپنی گردنیں جھکا دی تھیں۔ رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ۔[1]

فہرست کتب موجودہ مکتبہ جماعت اسلامی

مکتبہ جماعت اسلامی کی اپنی مطبوعات میں سے مندرجہ ذیل اسوقت موجود ہیں

تجدید و احیائے دین عہ، پردہ غیر مجلد ۱۲، پردہ مجلد ۱۲، سلامتی کا راستہ ۶ر، اسلام اور جاہلیت ۶ر، اسلام کا سیاسی نظریہ ۶ر، ایک اہم استفتاء ۲ر، راہِ عمل ۶ر، جہاد فی سبیل اللہ ۶ر، نشانِ راہ ۶ر، نیا نظام تعلیم ۶ر، معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل ۶ر، خطبۂ تقسیم اسناد ۲ر، دستور جماعت اسلامی ۲ر، مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ اول عہ، حصہ دوم ۱۲، حصہ سوم عہ، روداد جماعت اسلامی ۹ر، حصہ دوم ، اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے ۶ر، اسلام کا اخلاقی نقطۂ نظر ۶ر، خدا کی اطاعت کس لیے ۲ر، عبادت ۲ر، ایمان کی کسوٹی ۲ر، مسلمانوں کی طاقت کا اصلی منبع ۲ر، مسلمان کا بنیادی عقیدہ ۲ر (سفید اور خاکی)۔ بشکل چارٹ چھوٹا سائز اور جیبی سائز۔ Towords Under Standing Islam. (دینیات کا انگریزی ترجمہ مجلد) ے ر What is Islam. ۱۲

ہماری نئی مطبوعات

قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں ۱۲، اسلامی عبادات پر ایک تحقیقی نظر عہ، روداد جماعت اسلامی حصہ سوم ، حقیقت توحید ۱۲

---

[1] مطلب یہ ہے کہ یہ اصحاب کمال علم و عمل میں بڑے اونچے مدارج پر فائز تھے اور اصول دین کی سمجھ میں اور اجتہاد و قیاس کی مہارت میں کسی سے پیچھے نہ تھے بلکہ ممکن ہے کہ بعض پہلوؤں میں خلیفۂ راشد سے کچھ آگے ہی بڑھے ہوئے ہوں اس کے باوجود انھوں نے فکر و عمل میں خلیفہ کی سیادت و قیادت اور اطاعت و اعانت سے کبھی گریز کرنے کی جرأت نہیں کی ——— تا بدیگراں چہ رسد

شاہ صاحب کی ان توضیحات سے یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ نظام دینی کے ماتحت جس شخص کو امارت و خلافت کا درجہ ملتا ہے اس کی اطاعت و اعانت سیاسی حکمت کے ماتحت نہیں، بلکہ بطور دینی فریضہ کے واجب ہوتی ہے اور اس پر اخروی فلاح و خسران کا دارومدار ہے۔ (ا۔ ص)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قانون بقائے انفع

(اجتماعیات میں تحفظِ حق و عدل کا فطری اہتمام)

"ما ینفع الناس فیمکث فی الارض"

"انسان کی ساری قدر و قیمت کا انحصار اس کے مفید انسانیت ہونے پر ہے اور ہمیں وہ رویہ اختیار کرنا چاہیے جو ہمارے وجود کو دنیا کے لیے زیادہ سے زیادہ مفید بنا سکے!" (گاڈون)

حصہ اول

"تاریخ کے جدلی عمل میں تکرار" کے زیرِ عنوان ہم نے یہ حقیقت پیش کی تھی کہ عرصۂ تاریخ میں حق اور باطل، ظلم اور عدل، نیکی اور بدی خیر اور شر باری باری سے غلبہ پاتے چلے آ رہے ہیں اور یہ کہ ہماری اجتماعی زندگی کی کائنات میں بھی آفتابِ حق و عدل کا طلوع و غروب صبح و شام کا سماں پیدا کرتا رہتا ہے! ——— سوال یہ ہے کہ پھر حق اور باطل میں، خیر و شر میں، ظلم اور عدل میں فرق کیا ہوا؟ اگر ان ضدین میں انسان کے لیے کوئی فرق نہیں ہے اور اس کی فطرت کا ترازو متضاد اخلاقیاتی "اقدار" میں سے کسی ایک نوعیت کے اقدار کو مستقلاً وزن دینے والا نہیں ہے تو پھر حق اور نیکی، خیر اور عدل کے نام پر دنیا کو جمع کرنے کی مساعی سراسر عبث ہیں اور اخلاق اور قانون اور مذہب اور فلسفے، سب تاش اور چوسر اور گنجفے کے کھیلوں سے زیادہ قدر و قیمت نہیں رکھتے۔ آئندہ سطور میں اسی غلط فہمی کے سدباب کے لیے کچھ خیالات آپ کے سامنے پیش کیے جا رہے ہیں۔ ان سطور سے یہ واضح ہو جائے گا کہ انسانی فطرت کا جھکاؤ حق ہی کی طرف ہے اور اگر باطل کی طرف وہ لپکتی ہے تو محض فریب خوردگی کی وجہ سے۔ اس کی یہی فریب خوردگی باطل کی تاریکیوں کو حیاتِ اجتماعی میں تسلط پانے کا موقع دیتی ہے اور اس طرح حق و باطل کی وہ دوامی آمیزش جاری رہتی ہے جس سے زندگی کی ساری ہماہمی قائم ہے!

علاوہ بریں اس باب سے توافق للبقا کے اصول کی کچھ مزید وضاحت بھی از خود ہو جائے گی۔ توافق للبقا کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ سوسائٹی کی تشکیل و تعمیر حق و عدل کے اصولوں پر ہو اور یہ فطرتِ انسانی کا ایک قوی ترین مطالبہ ہے جس کا سامنا ہم عملی زندگی میں بداہتہً کرتے ہیں مگر نظری طور پر موجودہ دور نے اسے نظرانداز کر رکھا ہے۔

تعارفِ مدعا یہ کائنات جس کے گہوارے میں حیاتِ انسانی پرورش پا رہی ہے، اس کے ارتقا کے معنی یہ ہیں کہ یہ مضرات کو ختم کرتی ہے، اور مفیدات کی حفاظت کرتی اور ان میں سے "انفع" کو بقا دیتی ہے! اربابِ فلسفہ اسے ذی شعور نہ مانیں، مگر کوئی نہ کوئی شعور اس کے نظم میں دخیل ہے جو جھاگ کو خشک کر کے نابود کرتا اور پانی کو بچا رکھتا ہے، جو خس و خاشاک کو منتشر کرتا اور تخم کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کو سینے سے چمٹا کر رکھتا ہے، جو خزف ریزوں کو اٹھا اٹھا کے دریائے بقا میں سے باہر پھینکتا اور موتیوں کو اس تہ میں محفوظ کرتا رہتا ہے۔ ہر چیز اس شعور کے سایۂ اقتدار میں اسی وقت تک برقرار رہتی ہے، جب تک اس کا وجود افادیت کا سرچشمہ ہوتا ہے۔ جہاں افادیت ختم ہوئی، عناصر کی ترتیب و ترکیب پریشانی کے انجام کو پہنچی۔

اصولاً یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ نظامِ عالم جن اصول و ضوابط پر چل رہا ہے وہ حسن و خیر کو ظہور دینے والے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں، اہتمام جو کائنات کو چلانے والے شعور کی طرف سے کیا گیا ہے، صرف حسن و خیر کی پرورش کے لیے ہے۔ مگر اس نظام میں کچھ رخنے ایسے چھوڑے گئے ہیں جن سے حسن و خیر کی ضد یعنی قبح و شر بھی ابھر سکے۔ کیونکہ کوئی وجود، کوئی وصف اور کوئی کیفیت اپنی ضد رکھے بغیر اور اس کی مزاحمت کے بغیر نہ تو نشوونما پا سکتی ہے اور نہ اس کی امتیازی حیثیت و قدر قائم ہو سکتی ہے[۱]۔ اب فطرت کا سلوک یہ ہے کہ جمال و خیر کو تو ظہور دینے کے بعد وہ اپنی چھاتیوں کا دودھ پلا پلا کر پالتی اور لوریاں دے دے کر پروان چڑھاتی ہے، لیکن اس کے ساتھ ایک اہم مقصد کے لیے جو قبح و شر سر اٹھاتا ہے، اسے میدانِ بقا سے باہر دھکیلتی رہتی ہے! مثلاً فطرت کا دہقان ہواؤں اور سورج کی شعاعوں اور بارش کے چھالوں سے ایک قطعۂ ارضی کو جنبیلی کے پودے اگانے کے لیے تیار کرتا ہے مگر اس میں جنبیلی کے پودوں کی اوٹ میں بھٹ کٹیا بھی زمین سے ابھرنے لگتا ہے۔ اب جمال و قبح پہلو بہ پہلو پلتے ہیں مگر دونوں کو قسمتِ بقا میں سے یکساں حصہ نہیں دیا جاتا۔ جنبیلی کے پودے بڑھتے ہیں، زندہ رہتے ہیں اور پھیلتے چلے جاتے ہیں اور ادھر بھٹ کٹیا بڑھتا ہے، سوکھتا ہے اور اس کے اجزا منتشر کر دیے جاتے ہیں۔ وہ دوبارہ، سہ بارہ، چہار بارہ سعیِ بقا کو جاری رکھتا ہے مگر ہر بار نظمِ فطرت کا سلوک اس کے ساتھ وہی رہتا ہے۔ پھر اسی طرح بارش ہوتی ہے تو اس کے ساتھ برق و رعد کا ایک طوفان بھی نمودار ہوتا ہے، مگر اس طوفان کا ظہور وقتی ہوتا ہے، بخلاف اس کے طوفان کے ساتھ جو پانی برسایا جاتا ہے وہ نابود نہیں ہوتا، بلکہ باقی رہتا ہے اور نباتات و حیوانات کی ضروریات پوری کرنے میں صرف ہوتا ہے۔

دوسری صورت ظہورِ قبح و شر کی یہ ہوتی ہے کہ بعض اشیا یا حوادث اصلاً تو اپنے اندر افادیت یعنی جمال و خیر کی صفت رکھتے ہیں، لیکن جب وہ اپنا مقصد پورا کر چکتے ہیں تو اس کے بعد وہ بیکار ہو کر قبح و شر کی سطح پر آجاتے ہیں۔ اب حکیمِ فطرت کا جھاڑو انھیں بھی کوڑے کی دوسری اقسام کے ساتھ سمیٹ سماٹ کر بارگاہِ وجود سے باہر نکال دیتا ہے۔ مثلاً پودوں پر پورا اس مقصد سے آتا ہے کہ اس کے ذریعے سے اس کی شاخیں پھلوں سے مالا مال ہو جائیں یا خوشنما پھولوں کا ظہور اس لیے ہوتا ہے کہ بیج نمودار ہوں۔ اب جس وقت پودے میں پھل آنا شروع ہوتا ہے تو بور ختم ہونے لگتا ہے اور اسی طرح جب شاخوں کے سروں پر بیج دان پیدا ہو جاتے ہیں تو پھولوں کی پنکھڑیاں مرجھا مرجھا کر منتشر ہونے لگتی ہیں۔ یہی صورت حیوانات میں بھی ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔ انڈے کے خول کی ساری اہمیت اسی وقت تک ہے، جب تک کہ اس کے اندر محفوظ کیا ہوا مواد ایک وجودِ ذی روح بن کر خول کی حفاظت سے بے نیاز نہ ہو جائے۔ یہی حیثیت دودھ پلانے والے جانوروں میں مشیمہ کی ہوتی ہے کہ جس دن اس کا مقصدِ وجود پورا ہو چکتا ہے، اس کا تعلق بچہ اور زچہ دونوں سے منقطع ہو جاتا ہے۔

[۱] اسی بنا کر بعض اربابِ فلسفہ نے جمال و خیر کے دو شعبے قرار دیے ہیں، مثبت اور منفی، مراد یہ کہ چونکہ جمال و خیر کا احساس منحصر ہے قبح اور شر کے تصور پر لہٰذا قبح اور شر کو بھی بالواسطہ جمال و خیر ہی سمجھنا چاہیے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

المختصر موجودات کی ساری ہیئت کائنات کے مجموعی مقصد اور اس مقصد کے بھی جزوی مقاصد کے ساتھ وابستہ ہے۔ جو چیز حصولِ مدعا میں جہاں تک معاون ہے، اسے برقرار رکھا جاتا ہے، مگر جہاں وہ بے کار یا مضر ہو جاتی ہے، ایک عضوِ معطل کی طرح کاٹ کر الگ پھینک دی جاتی ہے۔ یہ نظامِ فطرت اپنی قوتوں کی کوئی رتی بے کار نہیں جانے دینا چاہتا اور ایسے موجودات کی تیاری ( ) اور حفاظت پر ایک لمحہ صرف کرنا نہیں چاہتا جو زندگی کی "منڈی" میں کوئی قیمت نہ پا سکیں!

انسانی زندگی کا جائزہ

فطرتِ انسانی کا ضمیر بھی بالکل اسی نہج پر اٹھایا گیا ہے۔ وہ بھی معاشیات و اخلاقیات میں قبح و شر سے گریزاں اور جمال اور خیر کی طرف دواں رہتی ہے۔ اس کے مختلف پہلوؤں میں سے جس پہلو کو بھی لیا جائے، اس میں یہی اصل الاصول کارفرما نظر آئے گا۔

اولاً اس کے نظامِ جسمانی کو لیجیے۔ اس کی حیات تنفس کی مقتضی ہے۔ اب دیکھیے کہ عملِ تنفس کی شان کیا ہے؟ سانس لیتے وقت ہوا کی مختلف اقسام اندر چلی جاتی ہیں، مگر پھیپھڑے کے واسطے سے خون ان میں سے مفیدِ مطلب قسم یعنی آکسیجن کو قبول کر لیتا ہے اور اس کے پاس عملِ استحالہ کے ماتحت جو کاربن جمع ہو چکی ہے، اسے وہ دفع کر دیتا ہے۔ پھر نظامِ تغذیہ میں بھی یہی صورت پائی جاتی ہے کہ معدہ اول تو حواس و شعور کے تعاون سے چھانٹتا ہی قوت بخش اور صحت افزا غذا کو ہے، پھر اس قبول کردہ غذا میں سے جتنا حصہ کارآمد ہوتا ہے اسے بدن کی ضروریات پوری کرنے کے لیے محفوظ کر لیتا ہے اور بقیہ فضلات کو باہر دھکیل دیتا ہے۔ یہی نہیں، بلکہ بدن کے مختلف حصص میں جو مادی اجزاء کیمیاوی عمل سے متغیر ہو جاتے ہیں، یا اپنا مقصد پورا کرتے کرتے اپنی قوت کھو چکے ہیں، انھیں بھی قوتِ مدبرہ الوداع کہہ دیتی ہے! پھر دیکھیے کہ فاسد خارجی اثرات کی روک تھام کس طرح ہوتی ہے۔ پھیپھڑے میں اگر کوئی مضر مواد پہنچ جائے تو وہ "کھانسی" کے عمل سے اسے دور کرتا ہے، اگر غذا کا کوئی ریزہ یا پانی کا کوئی قطرہ اپنی اصل راہ سے ہٹ کر ہوا کی نالی میں چلا جائے تو "اچھو" جیسا چست سنتری اسے راہ پر ڈال دیتا ہے، اگر ناک کی نالیوں میں کوئی چیز حائل ہو رہی ہو تو "چھینک" کا پاسبان راستہ صاف کر دیتا ہے، آنکھوں میں ریت کا کوئی ذرہ آ پڑے تو ارد گرد کی گلٹیاں ایک لعاب اگلنا شروع کر دیتی ہیں اور اس کے سیلاب میں اس "چٹان" کو بہا لے جاتی ہیں، خون میں کوئی گندہ عنصر شامل ہو جائے تو قوتِ مدافعت اسے مساموں کی راہ سے باہر نکالنے کے لیے خون پسینہ ایک کر دیتی ہے اور اگر یوں کامیابی نہ ہو تو پورے بدن میں حرارت کا ایک تنور دہکا دیا جاتا ہے جس کی تاب نہ لا کر "دشمن" پسپا ہو جائے، پھر کبھی یہ صورت اختیار کی جاتی ہے کہ بیرونی عناصر کو اِدھر اُدھر ہانک کر زیرِ جلد بھوڑے پھنسیوں کے "بلیک ہولوں" میں بند کر دیا جاتا ہے اور جب ان کا "دماغ درست" ہو چکتا ہے تو ان بلیک ہولوں کی بیرونی دیواریں توڑ کر ان "جنگی قیدیوں" کو رخصت کر دیا جاتا ہے۔ الغرض ہمارے بدن کا ایک ایک ذرہ کائنات کے مجموعی نظم کے ماتحت مضرت کا دشمن اور افادیت کا قدرداں ہے!

پھر انسان کی حسی زندگی کا پہلو سامنے آتا ہے۔ اس کے آلات جس جمال و خیر کے دلدادہ اور قبح و شر سے گریزاں ہیں۔ مثلاً اس کی حسِ لمس سختی اور کھردرے پن کو ناپسند کرتی ہے اور نرمی و نزاکت پر جان دیتی ہے۔ اس کی بصارت گندگی، بدنمائی، بے ترتیبی اور تاریکی سے نفور اور خوبصورتی، صفائی، تناسب اور روشنی کی شیدائی ہے۔ اس کی سماعت ڈراؤنی اور کریہہ آوازوں سے مجروح ہوتی ہے اور مسرت افزا لطیف صداؤں سے لطف لیتی ہے۔ اس کی قوتِ ذائقہ تلخی اور کسیلے پن سے ابا کرتی اور شیرینی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور چٹ پٹے پن کی مشتاق ہے۔ اس کا مشام تعفن سے تکلیف محسوس کرتا ہے اور خوشبو کو جذب کرکے آسائش پاتا ہے۔ چنانچہ یہ ذاتی حس باورچی خانہ میں، دفاتر میں، دکانوں اور بازاروں میں، تعمیرات اور آرائشات میں، لباسوں اور پوشاکوں میں، وضع قطع اور بول چال میں، غرضیکہ زندگی کے ہر کونے اور ہر گوشے میں محرک ارتقاء ہے۔ کیونکہ یہ مضرت کے رد اور منفعت کے قبول کے فطری اصول کے مطابق کام کرتا ہے۔

اس سے آگے نکلیے تو ادراکی زندگی کا دائرہ آتا ہے۔ یہاں بھی قاعدۂ کلیہ وہی ہے۔ غلط علم یعنی باطل آدمی کے لیے مضر ہے اور صحیح علم یعنی حق اس کے لیے مفید ہے۔ بس انسان یہی نہیں کہ جاننا چاہتا ہے، بلکہ یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ حق جاننا چاہتا ہے۔ وہ امر واقعہ کو اس کی اصلی شکل میں معلوم کرنے کا مشتاق ہے۔ وہ جھوٹ کو اگر قبول کرتا ہے اور غلط فہمی اس کے ذہن میں راہ پاتی ہے تو محض اس لیے کہ اس کی نظر دھوکا کھا جاتی ہے اور باطل اس کے سامنے حق و صداقت کا جامہ اوڑھ کے آتا ہے۔ باطل کا جو دام بھی آدمی کے پھانسنے کے لیے بچھایا جائے اس کے اوپر حق کے کچھ دانے ضرور بکھیرے جانے چاہئیں، ورنہ یہ "مرغ زریں" ہاتھ نہیں آسکتا۔ کیونکہ اس کے ذہن کی اصلی غذا حق و صداقت اور واقعیت ہی ہے۔ اسی غذا کے نتائج میں یہ اپنے نشیمن بلند سے اتر کر باطل کے کسی خفیہ پھندے میں قدم رکھتا ہے۔

اخلاقیاتی زندگی کے دائرہ میں اب ہم انسان کی تہذیبی و تمدنی زندگی کی سرحد پر کھڑے ہیں۔ اس کے جنگلے کو عبور کرنے سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ہماری اخلاقی و اجتماعی زندگی کا جالا مطالبات جسم، مطالبات احساس اور مطالبات ادراک ہی سے بنا جاتا ہے۔ پھر جب یہ بات صاف ہو چکی ہے کہ آدمی حیاتِ جسمانی، حیاتِ حسی اور حیاتِ ادراکی، تینوں دائروں میں مضرت کو دفع کرتا اور وافادیت کو قبولیت کے اعزاز سے سرفراز کرتا ہے تو یقیناً اخلاقی زندگی میں بھی اس کا اصولِ حرکت یہی ہونا چاہیے۔ چنانچہ ہے بھی یہی!

نظمِ اجتماعی اسی بنا پر نمودار ہوا کہ فردِ انسانی کی ضروریات اس کی قوتوں سے وسیع تر واقع ہوئی ہیں، جیسا کہ پائن نے اپنی کتاب "انسانی حقوق" (　　　) میں لکھا ہے کہ:-

"فطرت نے آدمی کے حیاتی تقاضوں کو اس کے قویٰ سے عظیم تر بنایا ہے"

پس ایک سوسائٹی میں رہتے ہوئے آدمی کے لیے یہ محسوس کرنا ناگزیر ہے کہ جس مجبوری نے اسے اجتماع کا رکن بنایا ہے اسی مجبوری نے دوسروں کو بھی تمدن کی راہ پر گامزن کیا ہے۔ اس احساس کے ماتحت آدمی میں اخلاقی شعور نمودار ہوتا ہے اور وہ زندگی کے مختلف مشاغل میں کوئی اقدام کرتے ہوئے یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ تمدن کے سایہ میں رہنے کی وجہ سے دوسروں کی طرف سے اس پر کیا فرائض عائد ہوتے ہیں۔ وہ خاندان، محلہ، شہر، ملک اور دنیا کی آبادی سے کسی نوعیت کا تعلق رکھتا ہے اور ان کے کن کن حقوق کا اسے پاس کرنا ہے؟ اس سوچ کے جواب میں انسان دو رویے اختیار کر سکتا ہے، ایک یہ کہ وہ اپنی پوری توجہ کو اپنے نفع پر مرتکز کر دے اور دوسروں کو جہنم میں جھونک دے۔ دوسرا یہ کہ وہ اپنے اور دوسروں کے نفع کو بیک وقت ملحوظ رکھے، بلکہ صاف تر لفظوں میں اپنے نفع کو سوسائٹی کے نفع کے تابع کر دے کیونکہ وہ سوسائٹی کے بدن کا ایک عضو ہونے کی حیثیت سے ہر اس نفع و نقصان میں حصہ دار ہے جو سوسائٹی کو پہنچتا ہے۔ ان میں سے اول الذکر خود غرضانہ رویہ سوسائٹی کے شیرازہ کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

درہم برہم کرنے والا ہے اور اسے "ظلم" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے اور ثانی الذکر رویہ افراد کو مربوط بنا کر سوسائٹی کو ارتقا دینے والا ہے اور اس وجہ سے اسے "عدل" کا عنوان دیا جا سکتا ہے۔ پھر ان دونوں اصولی رویوں میں سے جس کو بھی پیش نظر رکھا جائے اس کے تحت مختلف جزئیات حیات میں آدمی بے شمار حدود و ضوابط تجویز کرتا ہے۔ ان حدود و ضوابط میں بھی جہاں جہاں نفس پرستی دخل پاتی چلی جاتی ہے ظلم و فساد بروئے کار آتا جاتا ہے اور جتنا میدان خیر خواہی انسانیت کے قبضہ میں رہ جاتا ہے اتنے میں عدل کا تسلط قائم ہو جاتا ہے۔

لیکن انسان اپنے لیے عملی رویہ تجویز کرنے سے پہلے کائنات اور زندگی، تمدن اور شعور وغیرہ کے متعلق کوئی نہ کوئی حکم لگانے پر مجبور ہے۔ قدم قدم پر اس کے سامنے یہ سوالات آتے ہیں کہ یہ ہنگامۂ کائنات کیا ہے؟ اس میں زندگی کی نمود کیونکر ہوئی؟ یہ شعور کدھر سے آ گیا؟ یہ تمدن کیا ہے اور اس کے تقاضے کیا کیا ہیں؟ یہ صنفی ربط کیا معنی رکھتا ہے؟ وغیرہ۔ اسی معنی کی طرف ایف۔ جی۔ سی۔ ہیرنشا ("انقلابی دور کے بعض مفکرین کے سیاسی و اجتماعی افکار" صفحہ ۱۵۳) کا مقولہ بھی اشارہ کرتا ہے کہ

"کسی شخص کا سیاسی نظریہ بہت بڑی حد تک کائنات اور انسان کی فطرت سے تعلق رکھنے والے ان بنیادی نظریات سے متشخص و متعین کیا جا سکتا ہے جنھیں وہ کسی نظام افکار کی تعمیر کے وقت شعوری یا غیر شعوری طور پر اختیار کرتا ہے"۔

تمام الہامی اور عقلی دساتیر حیات اپنے مخصوص بنیادی نظریات پر قائم ہوتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ انسان خدا کا پیدا کردہ اور اس کا غلام ہے اور کوئی کہتا ہے، نہیں یہ خود بخود مادہ کی شاخ سے پھوٹا ہے۔ ایک طرف سے ہانک لگائی جاتی ہے کہ "انسان پیدائشی گنہ گار ہے"، دوسری طرف سے یہ آواز آتی ہے کہ نہیں اسے نیکی کے سوا کچھ آتا ہی نہیں! ایک مسلک کے نمائندے چلاتے ہیں کہ زندگی ایک عذاب ہے جو آدمی پر دیوتاؤں کی طرف سے مسلط کیا گیا ہے، ایک دوسرے مسلک کے علمبردار چیخ کر کہتے ہیں کہ نہیں دنیا ایک کلب گھر ہے جس میں چار دن ناچنے کودنے کے لیے ہمیں خوش قسمتی سے موقع مل گیا ہے! نظام تمدن کے متعلق ایک اسٹیج سے یہ کہا جاتا ہے کہ اصل مقصود فرد کی خوشی ہے اور سوسائٹی اس مقصود کے لیے وجود پاتی ہے، ادھر دوسرے اسٹیج سے یہ دعویٰ پیش کیا جاتا ہے کہ نہیں فرد کی مسرت اجتماعی مسرت سے الگ نہیں، اس لیے اصل مقصود اجتماع کی مسرت ہے۔

ان مختلف نظریات سے بالکل قدرتی طور پر مختلف عملی رویے نمودار ہوتے ہیں اور اس سلسلہ میں بنیادی اصول یہ ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ نظریہ اگر "حق" ہوگا تو اس کے نتیجہ میں عملیہ لازماً "عدل" کی تعریف میں آئے گا اور نظریہ اگر باطل ہوگا تو عملیہ لازماً "ظلم و فساد" کی شکل اختیار کرے گا۔ اس طرح گویا نظریۂ حق اور عملیۂ عدل اور نظریۂ باطل اور عملیۂ ظلم مل کر دو متقابل قوتیں بن جاتی ہیں۔ اب سوال یہ حل طلب ہے کہ انسانی فطرت حق و عدل اور ظلم و باطل کے فریقین میں سے کس کی طرف میلان رکھتی ہے؟

آج تک کی تاریخ اس پر گواہ ہے کہ باطل اور ظلم نے ہمیشہ انسانیت کو دکھوں اور مصیبتوں میں مبتلا کیا ہے اور ستم پرستی و فساد انگیزی نے ہر بار اقوام و ملل کو روز بد سے دوچار کیا ہے۔ دوسری طرف ہادیٔ تاریخ کا یہ اعلان بھی ہمارے سامنے ہے کہ حق اور انصاف نے ہمیشہ مسرت و اطمینان کے زمردیں برادے کو فضائے حیات میں بکھیرا ہے اور صداقت و خدمت نے ہر بار جماعتوں اور گروہوں کو مئے بقا پلانے میں کھول کھول کر مظاہرۂ سخاوت کیا ہے۔ تاریخ کے ان دونوں فتووں سے دنیا کا احمق سے احمق انسان بھی آگاہ ہے اور اس کی بصیرت کبھی یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہے کہ حق و عدل دشمن انسانیت ہیں اور ظلم و

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

باطل اس کے لیے مفید مطلب ہیں۔ غلطی صرف تعین حق و باطل اور امتیاز ظلم و عدل میں ہوتی ہے اور اس غلطی کے متعدد وجوہ ہیں جن کے بیان کا یہ موقع نہیں۔ ہمیں یہاں جو چیز عرض کرنی مطلوب ہے وہ صرف یہ ہے کہ انسان جو افکار اور جو اعمال اختیار کرتا ہے انھیں دوامًا یا وقتی طور پر اور اسی طرح پوری نوع کے لیے یا جماعت کے لیے یا ذات کے لیے عین حق و عدل پر محسوس جان کر اختیار کرتا ہے۔

انسانی اخلاقیت کا معدہ کسی طرح غیر حق اور غیر عدل کو قبول کرنے پر تیار نہیں ہوتا، کیونکہ صرف حق و عدل ہی اس کی فطری غذا ہے، الّا یہ کہ اس کی حس امتیاز کچھ موثرات کے طویل عمل سے معطل ہو چکی ہو یا مسخ کر دی گئی ہو۔ مگر اس صورت میں بھی ظلم و باطل کی بوٹیاں اس سے نگلوانے کے لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ ان پر حق کا شہد اور عدل کی شکر چڑھا دی جائے۔ چنانچہ ایک ملحد کو انکار خدا کا عقیدہ اختیار کرنے کے لیے کتاب کائنات کی کتنی ہی آیات سے آنکھیں بند کرنی پڑتی ہیں اور انفس و آفاق کی کتنی ہی سورتوں کو محرف کرنا ہوتا ہے، جب کہیں وہ اپنے ذہن کو یہ دھوکا دینے میں کامیاب ہوتا ہے کہ خدا کا انکار ہی امر حق اور مطابق واقعہ ہے۔ اسی طرح ایک چور اور ڈاکو کو اپنے جرم کے لیے وجوہ جواز گھڑنے پڑتے ہیں۔ وہ کسی ڈاکہ زنی کو توحق انتقام کے ماتحت جائز ٹھیراتا ہے، کسی کو خودداری اور غیرت کے نام پر مباح کرتا ہے، کسی کو مجبوری و بیچارگی کے عنوان سے معقول قرار دیتا ہے، تب کہیں اس کی حس اخلاقیت اسے آرام کی نیند سونے دیتی ہے، ورنہ وہ ہر ظالمانہ اقدام پر ویسا ہی اضطراب اس کے ذہن میں برپا کر دیتی ہے جیسا زندہ مکھی نگل لینے سے معدہ میں برپا ہوا کرتا ہے۔ اس اضطراب سے سلیم الفطرت آدمی تو غلطیٔ فکر و عمل پر متنبہ ہو کر آئندہ احتیاط کرتا ہے مگر احمق اس "اخلاقی متلی" کو دبا دینے کے لیے قسم قسم کے چورن اندر اتارتا جاتا ہے تا آنکہ متلی رک جاتی ہے اور مکھی ہضم ہو جاتی ہے۔ پھر جب ایسی حماقت بار بار کی جاتی ہے تو ذہنی معدہ کی فطرت ہی بدل جاتی ہے اور وہ خوشی خوشی مکھیاں ہضم کرنے لگ جاتا ہے اور کج فطرت آدمی باقاعدہ مگس خور ہو کے رہ جاتا ہے۔

پس غیر مسخ شدہ فطرت انسانی کا مطالبہ حق و عدل کے سوا کچھ نہیں ہے اور انسانیت ہمیشہ اخلاقی رویہ کے پس پردہ کام کرنے والے نظریات میں سے نظریۂ حق کو قبول کرنا چاہتی ہے اور اسی طرح اجتماعی اعمال کی اشکال میں سے وہ عادلانہ اشکال کو پسند کرتی ہے۔ اس غرض کے لیے فطرت نے جو پُراسرار انتظام کر رکھا ہے، ذرا اس کا جائزہ لیتے چلیں اور اس امر پر غور کریں کہ نفس انسانی کس کس ذریعہ سے ظلم و باطل کی مدافعت کرتا ہوا حق و عدل کی طرف لپکتا رہتا ہے۔

ذہن انسانی کی بارگاہ میں کسی نظری یا عملی اصول کا باریابی کی اجازت پر منحصر ہوتا ہے ان میں سب سے پہلے "تشکیک" کا نام آتا ہے۔ کوئی نیا خیال چاہے اندر سے ابھرے یا باہر سے گھسے، دربار نفس میں اگر کوئی مستند حیثیت حاصل کرنا چاہتا ہو تو تشکیک پہلے اسے ترچھی نظروں سے دیکھتا ہے اور پھر اسے اپنے دوسرے ساتھی "تنقید" کے حوالہ کرتا ہے کہ ذرا لینا اس کی جامہ تلاشی اور دیکھنا اس کی سندات کو کہ یہ حضرت حق و عدل کے علمبردار ہیں یا ظلم و باطل کے نمائندے؟ چنانچہ تنقید کا پہرہ دار اس نووارد کا "پروانۂ رہداری" دیکھتا ہے اور ذہنی بارگاہ میں جگہ پانے کے لیے اس کے پاس جتنے دلائل ہوتے ہیں ان سب کا جائزہ لیتا ہے، نیز ایک حد تک یہ اطمینان کرنے کی بھی کوشش کرتا ہے کہ اس کے ظاہر فریب لباس حق و عدل کے اندر کہیں ظلم و باطل کے اسلحہ تو چھپے ہوئے نہیں ہیں۔ پھر اگر تنقید کا سنتری نووارد نظریہ یا عملیہ کو باریابی کی اجازت دیتا ہے تو اسے دربار میں ایک مناسب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

درجہ کی نشست حاصل ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد حسِ اخلاقی (ضمیر) کی مستقل نگرانی جاری رہتی ہے اور وہ دیکھتی رہتی ہے کہ کہیں ایسے اصول و نظریات تو نہیں ابھر رہے ہیں جو تجربہ میں کھوٹے ثابت ہوں۔ یہ قوت نظریۂ باطل اور عملیۂ ظلم کے ذہن پر دخیل ہو جانے پر ایک تہلکہ مچا دیتی ہے اور وہ کیفیت پیدا نہیں ہونے دیتی جسے اطمینان کہا جاتا ہے۔ یہ بے اطمینانی گویا ذہنی اسمبلی کے ارکانِ عاملہ کے خلاف "ملامت کا ووٹ" ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ارکانِ عاملہ کی آمریت اس ووٹ کی کوئی پروا نہ کرے یا بہ جبر حسِ اخلاقی کا منہ بند کر دے، یا "مکارانہ بیانات" سے اس عدمِ اطمینان کی کیفیت کو ایک حد تک دبا دے، بہرحال یہ خفیہ پاسبان اپنا فرض ادا کیے بغیر نہیں رہتا۔[1]

لیکن اگر ضمیر غلطی ہی کھا جائے یا اس کی آواز کو دبا دیا جائے تو پھر نتائجِ اعمال آدمی پر دباؤ ڈال کر اسے اصلاح کے لیے مجبور کرتے ہیں، یعنی فطرت اس کی غلط کاریوں پر اپنے قوانین کے ماتحت کچھ سزا دینا شروع کرتی ہے اور اس سزا کا اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ آدمی ظلم و باطل سے ہٹ کر حق و عدل کی طرف رجوع کرے۔ لیکن تمدنی دنیا میں چونکہ فطرت فرد کو سوسائٹی سے علیحدہ کر کے نہیں دیکھتی ہے، اس لیے اکثر اوقات ایک فرد کے نتائجِ اعمال براہِ راست خود اس پر مترتب ہونے کے بجائے سوسائٹی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس صورت میں سوسائٹی اس پر قانونی اور اخلاقی دباؤ ڈالتی ہے کہ وہ اپنی اصلاح کرے۔ پھر اگر بالفرض کوئی فرد ایسا موقع آنے سے پہلے ہی چل بسے یا سوسائٹی کے دباؤ کے باوجود اپنی اصلاح نہ کرے تو بھی مختلف افکار و کردار کے نتائج کا ایسا ریکارڈ تاریخ کے پاس جمع ہو جاتا ہے جس سے نوعِ انسانی فائدہ اٹھاتی ہے۔

یہ سارے فطری انتظامات یہ بتاتے ہیں کہ انسان کی روح ظلم و باطل کا نہیں، بلکہ حق و عدل کا مطالبہ کرتی ہے۔ اور اس دعویٰ پر سب سے بڑی شہادت یہ ہے کہ آج تک انسان نے کبھی کسی نظریہ کو یہ کہہ کر پیش نہیں کیا ہے کہ یہ چونکہ باطل ہے، اس لیے پیش کیا جا رہا ہے اور نہ کبھی کسی نظریہ کو یہ مان کر قبول کیا ہے کہ چونکہ یہ غلط ہے، اس لیے قبول کیا جاتا ہے۔ اسی طرح کسی ظالم سے ظالم انسان نے بھی کسی طریقِ عمل کی طرف اس بنیاد پر دعوت نہیں دی ہے کہ یہ چونکہ عدل نہیں ہے اس لیے اسے اختیار کیا جانا چاہیے اور نہ کسی چنگیز اور ہلاکو نے بھی کسی کردار کو اس دلیل سے پسند کیا ہے کہ یہ چونکہ ظلم ہے اس لیے یہی موزوں ترین کردار ہے۔ نظریے ہمیشہ حق کے نام سے اور عملیے ہمیشہ عدل کے نام سے پیش اور قبول کیے گئے ہیں۔ یہ ہے بقائے اصول کے ماتحت تحفظ حق و عدل کے لیے فطرت کا اہتمام:

مگر "بقائے انفع" کے اصول کے ماتحت حق و عدل کے تحفظ کے اتنے انتظامات کے باوجود یہ ظلم و باطل اپنی شرانگیزیوں اور ضرر پاشیوں کے ساتھ کہاں سے آ ابھرتے ہیں؟ اس سوال کے جواب میں ہم ان رخنوں کی طرف مختصراً اشارہ کرتے ہیں جو شئے کے ذہن

---

[1] جدید فلاسفی ضمیر کی اس پاسبانی کو معتبر نہیں سمجھتی، کیونکہ ضمیر کے مطالبات مختلف سوسائٹیوں میں مختلف ہو جاتے ہیں، لیکن اس سے ضمیر کی اہمیت ختم نہیں ہو جاتی۔ ضمیر کا کام دراصل یوں ہوتا ہے کہ وہ کسی عقلی و اخلاقی غلطی کو قبول کرنے سے پورے زور کے ساتھ ابا کرتا ہے مگر جب کوئی غلطی "مضمون مسلمات" میں داخل ہو جاتی ہے تو پھر جیسے کچھ مسلمات ہوتے ہیں ضمیر انھیں کے معیار پر عقلی و اخلاقی اقدار کو قبول کرتا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح کہ انسانی معدہ "شراب" جیسی بدبودار و ہوش ربا چیز کو فطری غذا تسلیم کرنے پر تیار نہیں ہے مگر جب متواتر اسے اس کے قبول کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے تو شراب کی خواہش فطری غذاؤں کے مقابلہ میں کچھ زیادہ تیز ہی ہو جاتی ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انسانی میں در آنے کے چور دروازے ہیں ــــ تاکہ وہ "خیر" کی قوتوں کو چیلنج کرے، ان کو بیدار اور برسرِ عمل رکھے اور انسان نیکی یا بدی کو باہر سے بہ جبر مسلط ہوتا ہوا نہ پائے بلکہ دونوں میں سے کسی ایک کو اپنی پسند سے انتخاب کرے اور اس کے تحفظ و ارتقاء کی خاطر نظریات و عملیات کی عالمگیر دوامی معرکہ آرائیوں میں شریک ہو۔ صرف یہی صورت اس کے شعور کو ارتقاء کے راستہ پر رواں رکھنے والی ہے
خیر تو فرد کی ذہنی و عملی لغزشوں کی وجوہ بالعموم حسب ذیل ہوتی ہیں۔

میدانِ نظریات ــــ !

(۱) خواہش پرستانہ طرزِ فکر[1]:ــــ یعنی آدمی اپنا رویہ تو پہلے تجویز کرلے اور اسے موزوں و معقول قرار دینے کے لیے اساسی نظریہ بعد میں گھڑے، وہ بھی یوں کہ نظریہ حسب ضرورت پہلے متعین کرے اور اس کے لیے دلائل بعد میں ادھر ادھر سے ٹٹولتا پھرے "نظام المنطق" میں مِل نے بھی اس انسانی کمزوری کو تسلیم کیا ہے کہ اس کے جذبات اور اس کی خواہشات سے اس کا استدلال متاثر ہوتا ہے۔ علاوہ بریں متعدد دوسرے فلسفیوں نے بھی اس طرف اشارہ کیا ہے کہ آدمی پہلے نتائج ذہن میں رکھ لیتا ہے اور دلائل و قضایا بعد میں مترتب کرتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ عملی زندگی کے تقاضے فوری ہوتے ہیں اور وہ آدمی کو دو اقدامات میں سے کسی ایک کو انتخاب کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ پس آدمی وقتی ضروریات کے ماتحت اقدام کی سمت تو پہلے متعین کرلیتا ہے اور نظریہ بعد میں اس کے ساتھ نصب کرنے کی کوشش کرتا ہے، نیز اس نظریہ کے لیے دلائل سوچتا رہتا ہے۔ ایسی صورت میں عمل میں اعتدال کا بحال رہنا ممکن نہیں ہے۔ بجز ایک خوش اتفاقی کے اور خوش اتفاقی اخلاقیات میں شاذ ہی پائی جاتی ہے۔

(۲) اپنی محدود عقل پر کلی انحصار:ــــ یعنی جن امور میں حسی و تجربی عقل کی رسائی نہ ہو ان کی گرہ کشائی کے لیے بھی عقل ہی کے کمزور ناخنوں کو استعمال کرنا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ اساسی نظریات جن امور سے تعلق رکھتے ہیں ان کا ایک سرا مادی دنیا میں محسوس کیا جاسکتا ہے مگر ان کا دوسرا سرا تو پردۂ غیب کے پیچھے مستور ہے۔ لیکن محسوس سرے کی غلط سلط پیمائش میں جب انسانی عقل کچھ جوہر دکھانے لگتی ہے تو غیبی صداقتوں کو پالینے کیلئے بھی انسان اسی آلہ پر انحصار کرنے لگتا ہے۔ کچھ اسی طرح جیسے ناند میں تیر سکنے والی کاغذ کی ناؤ کو سمندر میں ڈال دیا جائے۔

(۳) ناکافی علم کے بل پر فیصلہ دینا:ــــ یعنی کسی حقیقت کو اس کے جملہ پہلوؤں کا احاطہ کرنے سے پہلے متعین و تشخص کرلینا۔ یہ صورت بھی فوری عملی تقاضوں کے ماتحت ظہور پاتی ہے۔ اور آدمی مجبور ہوتا ہے کہ جتنا علم اسے حاصل ہے، اسی کے بل پر خیر و شر کی تحدید کرے، چنانچہ وہ نظام تمدن کے پر پیچ و خیز عناصر کا کلی احاطہ نہ کرسکنے کی وجہ سے ٹھوکریں کھاتا ہے۔

(۴) قیاسات و مفروضات کو ثابت شدہ حقائق کا درجہ دینا:ــــ یعنی حقائق کو احاطہ کرنے کے پورے ذرائع موجود نہیں ہوتے ہیں، اس لیے ان کے معاملہ میں ظن و تخمین کے نتائج مستحضرہ کو واجب التسلیم تعبیر حقیقت مان لیا جاتا ہے۔ یہ چیز بھی زندگی کے فوری عملی تقاضوں کی وجہ سے واقع ہوتی ہے۔

[1] میکیاولی "پرنس" میں لکھتا ہے کہ لوگ مسائل کو ان کی واقعی شکل میں نہیں دیکھتے بلکہ اس شکل میں دیکھتے ہیں جو انھیں مرغوب ہوتی ہے اور پھر تباہ ہوکے رہ جاتے ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میدان عمل میں ——— !

(۱) سوسائٹی میں تفریق :— یعنی اپنے آپ کو یا اپنے کسی محبوب شخص یا مجموعۂ اشخاص کو عام سوسائٹی سے بالاتر سمجھنا اور اسی طرح کسی مبغوض شخص یا اشخاص کو عام انسان کی سطح سے فروتر قرار دینا اور پھر اسی تفریق کے مطابق اپنے عمل کو دو دخایاسہ رخا یا صد رخا بنا لینا یہاں آدمی اپنے جذبات محبت و نفرت، اخوت و عداوت وغیرہ کا آلۂ کار بنجاتا ہے۔

(۲) اعمال حیات کی تقسیم :——— یعنی ہمہ بیں نگاہیں محروم ہونے کی وجہ سے زندگی کے پورے عمل اور اسکے مجموعی نتائج کو کسی مرکزی نصب العین کے ماتحت رکھ کر دیکھنے کے بجائے اس کے ایک ایک جزئی عمل کے لیے الگ الگ سمت اقدام متعین کرنے کی شکل اختیار کر لی جاتی ہے۔

(۳) فطرتِ انسانی کو متغیر قرار دینا :— یعنی آدمی فطرتِ انسانی کے مطالبات اور انھیں پورا کرنے کے اصولوں کو دوامی اور عالمگیر ماننے کی جگہ تابع ماحول اور "وقتی" تسلیم کرکے بے اصولے پن پر اتر آتا ہے اور اس طرح اپنے ایک ایک جذبہ اور ایک ایک خواہش کا اتباع کرنے لگتا ہے۔

یہ ہیں وہ خفیہ شاہ رہے جن سے عالم افکار اور عالم کردار میں باطل اور ظلم کا داخلہ ہوتا ہے۔ یہ شاہ رہے کیوں کر بند کیے جا سکتے ہیں اور اس مقصد کے لیے فطرت نے کیا سامان فراہم کیے ہیں۔ اس کا مفصل جواب آگے چل کے دیا جا رہا ہے۔[۱]

یہاں اتنی بات ذہن نشین ہو جانی چاہیے کہ قانون بقائے انفع کے تحت سوسائٹی میں قبولیت صرف اسی فرد کے لیے ہے جو معاملات و تعلقات میں حق اور عدل کا لحاظ کرتا ہے اور جو اپنے انفرادی مطالبات کو پورا کرنے کے لیے دوسروں کے مفاد کو کچل ڈالنے کی جسارت نہیں کرتا۔ بخلاف اس کے اگر کوئی فرد ظلم کی برچھی لیکر کھڑا ہوتا ہے تو سوسائٹی کبھی بھی اسے سینے سے لگانے پر تیار نہیں ہوتی۔ آخر ایک شخص جو اسی کی چھاتی پر مونگ دلتا ہے، اسی کا خون چوس چوس کر پھلتا پھولتا ہے، اور اسی کا گوشت کھا کر موٹا ہوتا ہے، وہ اسے کیونکر سر آنکھوں پر جگہ دے سکتی ہے۔ ——— بجز اس صورت کے کہ کوئی دشمن انسانیت "خدمت" ہی کی قبا اوڑھ کے نمودار ہو اور کوئی "قاتل امن" شرافت ہی کا جبہ زیب بدن کرکے سامنے آئے اور روپے کے زور سے، طلاقت لسانی کے زور سے اور جاہ و منصب کے زور سے شر و فساد پھیلاتا رہے مگر کوئی اس کا بازو پکڑنے والا نہ ہو۔ یہ ہو سکتا ہے، مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ انسانیت صدق دل سے کسی قدر و قیمت کا مستحق قرار دے۔ سوسائٹی میں اصلاً قدر صرف "خدمت پیشہ" افراد کی ہے جو حق پر قائم اور عدل پر مستقیم ہوں اور یہی وجہ ہے کہ انتفاع پیشہ" افراد بھی بالعموم خدمت یعنی اتباع حق و عدل ہی کا جھنڈا اٹھائے ہوئے آگے بڑھتے ہیں، کیونکہ انھیں معلوم ہے کہ جانا پہچانا "ظلم" اور کھلا کھلا باطل کبھی بھی سندِ قبولیت حاصل نہیں کر سکتا۔ یہ صحیح ہے کہ ظلم کو اس کے خوفناک اسلحہ کے ساتھ کام کرتے ہوئے مختلف سوسائٹیوں میں دیکھا جا سکتا ہے مگر افسوس یہ ہے کہ سطح بیں لوگوں کی نگاہیں ان دبے دبے جذبات نفرت و حقارت کو نہیں دیکھ سکتیں جو مظلوم عناصر کے اندر پرورش پاتے رہتے ہیں اور فطری وقت پر جب وہ پھٹ پڑتے ہیں تو سوسائٹی کا نظام تہ و بالا ہو جاتا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کے دور آغاز میں اس کے علمبردار یہ کہاں مان سکتے تھے کہ ان کے کارخانوں میں بیلوں گایوں کی طرح کے بے بس انسانوں کا جو ریوڑ دن رات مصروف کار رہتا ہے یہ کل خود ان کے سروں پر اپنی ڈکٹیٹری کا تخت بچھانا چاہے گا مگر قانون فطرت یہی ہے کہ ظلم اگر ابھرے تو اسے مظلوموں کے ذریعہ کچلوا دیا جائے ——— دیر ہے مگر اندھیر نہیں!

(باقی آئندہ)

---

[۱] یہ سوال اس مضمون کے دوران میں حل نہیں کیا گیا ہے، بلکہ اسی سلسلہ کے آئندہ مضمون "شاہ راہِ ارتقا" کو اسی سوال کے لیے مخصوص کر دیا گیا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رسائل و مسائل

مفتوح فاتح کی عدالت میں

سوال:- آج کل جنگی مجرموں (War Criminals) کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کا بہت چرچا ہے۔ اسلام کا اس ضمن میں کیا حکم ہے؟

جواب:- یہ "جنگی مجرم" کی اصطلاح بھی ایک عجیب اصطلاح ہے جسے یورپ کے مکارانہ اخلاق نے موجودہ زمانہ میں ایجاد کیا ہے۔ اس کی اصلیت اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ ایک قوم جس سے کسی دوسری قوم کی لڑائی محض قومی اغراض کے لیے ہوئی تھی، جنگ میں فتح یاب ہونے کے بعد مفتوح قوم کے جنگی و سیاسی لیڈروں سے انتقام لینا چاہتی ہے۔ لڑائی دونوں طرف سے اقتدار اور منفعت طلبی کی خاطر ہوئی تھی۔ ایک دنیا پر پہلے مسلط ہو چکا تھا اور چاہتا تھا کہ اپنے تسلط کو اور ان فائدوں کو جو اس جابرانہ و ظالمانہ تسلط کی بدولت اسے حاصل ہو رہے تھے، محفوظ رکھے، اور دوسرا بعد میں آیا اور اس نے پہلے کے تسلط و اقتدار کو اپنی راہ میں رکاوٹ دیکھ کر اسے ہٹانا چاہا۔ اس لحاظ سے دونوں کی لڑائی کسی پاکیزہ اخلاقی غرض پر مبنی نہ تھی۔ لیکن اب جبکہ ایک فریق غالب آگیا تو وہ اپنے اس غصہ اور اس انتقامی جذبہ کو جو اس کے دل میں محض اس لیے بھڑکا تھا کہ مخالف فریق نے اس کے اقتدار کو چیلنج کیوں کیا، اخلاق کا رنگ دینے کی کوشش کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ہم تو نہیں مگر ہمارا فریقِ مخالف ایک ڈاکو اور بدمعاش تھا اور اس نے دنیا کے امن کو غارت کیا (گویا کہ خود انھوں نے دنیا کے امن کو کبھی غارت نہیں کیا تھا) اس نے بستیوں پر ظلم ڈھائے (گویا کہ ظلم و ستم ڈھانے کا ارتکاب ان سے خود کبھی نہ ہوا تھا) اور اس نے عہد و پیمان توڑے (گویا کہ یہ ہمیشہ عہد و پیمان کے بڑے پابند تھے)۔۔۔ اس لیے اس کے بڑے بڑے لیڈر اور فوجی کمانڈر مجرم ہیں اور انھیں اسیر جنگ کے بجائے اخلاق مجرم کی حیثیت سے سزا دی جانی چاہیے حالانکہ فی الواقع جس قومی جذبہ میں یہ خود سرشار ہیں اور ان کے لیڈر جس جذبے کے تحت اپنی قومی سربلندی کو برقرار رکھنے کے لیے کوشش کرتے رہے ہیں، اسی جذبہ سے ان کی مخالف قوم کے لیڈر بھی سرشار تھے اور اپنی قوم کے لیے سربلندی حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے، اور کوشش کے طریقوں میں اخلاقی نقطۂ نظر سے دونوں کے درمیان کوئی فرق نہ تھا۔ اب اصل غرض تو صرف یہ ہے کہ حریف قوم کے اندر جن لوگوں نے قومی جذبہ کو بھڑکایا تھا، اور جو اس امر کی قابلیت رکھتے تھے کہ اپنی قوم کو منظم کرکے اور اس کے وسائل کو ترقی دے کر میدان مقابلہ میں استعمال کرسکیں، انھیں ختم کر دیا جائے تاکہ یہ قوم ہمارے اقتدار اور ہمارے تسلط علی الارض کو پھر چیلنج کرنے کے قابل نہ ہو سکے، لیکن اس خالص انتقامی جذبہ کی گھناؤنی صورت کو اخلاقی عدل کی خوشنما نقاب میں چھپانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

یہ اخلاقی عدل کا ڈھونگ جس طرح ایک فریق کامیاب ہو جانے کے بعد رچا سکتا ہے، بعینہٖ اسی طرح دوسرا فریق بھی فتح یاب ہونے کے بعد رچا سکتا تھا، اور اس صورت میں بھی اخلاقی حیثیت سے یہ ایک نہایت ذلیل قسم کا مکر و فریب ہی ہوتا۔ میں حیران ہوں کہ موجودہ تہذیب نے دنیا کی بڑی بڑی متمدن اور ذی عزت قوموں اور ان کے مدبرینِ سلطنت کے اندر کس قسم کی بے حیائی پیدا کر دی ہے اور ان قوموں کے علماء و فضلاء اور فلاسفر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اخلاق کی اخلاقی حس کو کیسا کند کر دیا ہے کہ ایسی ایسی صریح مکارانہ باتیں علی الاعلان کی جاتی ہیں اور کسی کو ان کے اندر نہ شرم محسوس ہوتی ہے اور نہ کوئی ان کے گھناؤنے پن کو محسوس کرتا ہے۔ کون صاحب عقل و تمیز آدمی، جو عدل کے معنی کا ذرہ برابر شعور رکھتا ہو، یہ تصور کر سکتا ہے کہ جنگ کا ایک فریق عدالت کی کرسی پر بیٹھ کر دوسرے فریق کے ساتھ واقعی انصاف کر سکے گا؟ — اگر انفرادی زندگی میں کسی مقدمہ کا ایک فریق دوسرے فریق کے لیے جج نہیں بن سکتا تو قومی زندگی میں آخر ایک فریق جنگ دوسرے فریق جنگ کے لیے جج کیسے بن سکتا ہے؟

آپ پوچھتے ہیں کہ اسلام کا اس معاملہ میں کیا حکم ہے؟ میں کہتا ہوں کہ اسلام اس قسم کے کر کو مکر ہی سمجھتا ہے۔ اس کے نقطۂ نظر سے تمام وہ لوگ جو فریقین جنگ میں سے ایک دوسرے کے ہاتھ آئیں، اسیر جنگ ہیں اور اسیران جنگ کے متعلق اسلام کے احکام جو کچھ ہیں وہ واضح طور پر میں اپنی کتاب "الجہاد فی الاسلام" میں بیان کر چکا ہوں۔ لڑائی کے بعد عدالت کی کرسی پر بیٹھ کر مجرم کی حیثیت سے دشمن کو بلانا اور اس کا فیصلہ کرنے کے لیے خود بیٹھ جانا بہت بڑے پیمانہ کی اخلاقی بے حیائی چاہتا ہے اور اسلام وہ دین ہے جو حیا کو محض شعبۂ اخلاق ہی نہیں، بلکہ شعبۂ ایمان قرار دیتا ہے۔

میدان جنگ میں قحبہ گری کے انتظامات اور اسلام

سوال: آج کل جنگ میں جہاں سپاہیوں کو وطن سے ہزاروں میل دور جانا پڑتا ہے اور ان کی واپسی کم از کم دو سال سے پہلے ناممکن ہو جاتی ہے، سوشل قباحتیں مثلاً زنا وغیرہ کا پھیل جانا لازمی ہے کیونکہ جنگ کے جذبہ کی بیداری کے ساتھ تمام جذبات سفلی بھی بھڑک اٹھتے ہیں۔ اس چیز کو روکنے کے لیے یا قابو میں لانے کے لیے فوجیوں کے لیے رجسٹرڈ رنڈیاں بہم پہنچانے کی اسکیم پر عمل ہو رہا ہے اور ان کے دلوں کو خوش رکھنے کے لیے (W.A.C.I) دفتروں میں ملازم رکھی جا رہی ہیں۔ یہ دونوں صورتیں قابل نفریں ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ ان کی تردید کے بعد اسلام اس عقدہ کے حل کا کیا طریق بتاتا ہے۔ کنیزوں کا سسٹم کس حد تک اس قباحت کا ازالہ کر سکتا ہے اور کیا وہ بھی ایک طرح کی جائز کردہ قحبہ گری (Prostitution) نہیں ہے؟

جواب: آپ کے دوسرے سوال میں ایک پیچیدگی ہے جسے شائد آپ نے اپنا سوال تحریر کرتے وقت محسوس نہیں کیا۔ آپ جس مسئلہ کا حل دریافت کرنا چاہتے ہیں اس میں آپ کے پیش نظر تو ہیں موجودہ زمانہ کی فوجیں اور ان کی ضروریات، لیکن اس کا حل چاہتے ہیں آپ اسلام سے۔ حالانکہ اسلام جن فوجوں کی ضروریات کا ذمہ لیتا ہے وہ اس کی اپنی فوجیں ہیں نہ کہ فساق و فجار اور جبابرہ کی فوجیں۔

موجودہ زمانہ کی فوجوں کا حال یہ ہے کہ انھیں محض لڑنے کے لیے تیار کیا جاتا ہے اور جو سلطنتیں ان کو تیار کرتی ہیں، خود ان کے پیش نظر بھی کوئی پاکیزہ اخلاقی نصب العین نہیں ہوتا۔ اگر وہ اپنی قومی فوج تیار کرتی ہیں تو ان کے اندر صرف وہ اخلاقیات پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہیں جو قوم کا جھنڈا بلند کرنے اور بلند رکھنے کے لیے درکار ہیں، اور ظاہر ہے کہ ان اخلاقیات میں طہارت اخلاق کے عنصر کا کوئی مقام نہیں ہے — اور اگر وہ اپنی محکوم قوموں میں سے اپنی اغراض کے لیے فوجیں تیار کرتی ہیں تو انھیں صرف اس اخلاق کی تربیت دیتی ہیں جو پالتو شکاری کتوں میں پیدا کیا جاتا ہے (یعنی یہ کہ روٹی دینے والے کے وفادار رہیں اور شکار اس کے لیے ماریں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ذکر اپنے لیے) اس کے سوا کسی دوسرے سرے سے ان "مہذب" قوموں میں ہے ہی نہیں اور زنا، شراب، جوا اور دوسری قسم کی بداخلاقیاں تو نیچے سے لے کر اونچے طبقوں تک خود ان کے اندر پھیلی ہوئی ہیں۔ نیز جبکہ ان کا اخلاقی نقطۂ نظر ہی یہ ہے کہ "بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست" تو کوئی وجہ نہیں کہ ان کی فوجوں میں کسی قسم کا اخلاقی انضباط پایا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی فوجیں مار دھاڑ کے فنون میں تو انتہائی کمال کے درجہ تک پہنچ جاتی ہیں، لیکن طہارتِ اخلاق کے نقطۂ نظر سے پستی کی اس حد تک گری ہوئی ہوتی ہیں جس کا مشکل ہی سے کوئی انسان تصور کر سکتا ہے۔ انھیں کھانے کے لیے دل کھول کر راشن دیا جاتا ہے، پینے کے لیے خم شراب کا منہ ہر وقت کھلا رکھا جاتا ہے، خرچ کرنے کے لیے پیسے بھی کافی دے دیے جاتے ہیں، پھر سانڈوں کی طرح انھیں چھوڑ دیا جاتا ہے کہ اپنی خواہشاتِ نفس جہاں اور جس طرح چاہیں پوری کرتے پھریں۔ حکومتیں خود بھی ان کے لیے قحبہ خانے تیار رکھتی ہیں، قوم کی لڑکیوں میں بھی یہ جذبہ پیدا کیا جاتا ہے کہ وہ ملک و قوم کے لیے لڑنے والے سپاہیوں کی خاطر اپنے جسم رضاکارانہ طور پر پیش کرنے کو قومی ایثار اور سرمایۂ افتخار سمجھیں اور اس پر بھی جب ان انسانی نروں کے بھڑکے ہوئے جذبات ٹھنڈے نہیں ہو سکتے تو ان کو پوری آزادی حاصل ہوتی ہے کہ انسانی گلہ میں جہاں بھی ادائیں ان کو نظر آئیں، ان سے "بزور" یا "بزر" ان کے جسم خرید لیں یا چھین لیں۔ اس طرح جن فوجوں کو پالا گیا ہو، خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ جب وہ دشمنوں کے ممالک میں فاتحانہ داخل ہوتی ہوں گی تو وہاں ان کی شہوانی ضروریات کتنی بڑھ جاتی ہوں گی اور کس قیامت خیز صورت میں وہ پوری کی جاتی ہوں گی!

اب آپ خود ہی سوچ لیں کہ ایسی فوجوں کے مسائل اور ان کی ضروریات کا حل اسلام کیسے بتا سکتا ہے۔ انھیں مغرب ہی کے مادہ پرستانہ اخلاق نے پیدا کیا ہے اور ان کے شرمناک مسائل کا حل بھی وہی پیش کر سکتا ہے۔ اسلام جن فوجوں کو تیار کرتا ہے وہ سیاسی و معاشی جغرافیہ کے اوراق بگاڑنے اور جوڑنے کے لیے تیار نہیں کی جاتیں، بلکہ صرف اس لیے تیار کی جاتی ہیں کہ دنیا اگر خدا کی اطاعت سے پھری ہوئی ہو اور دعوت و تبلیغ سے راہ راست پر نہ آئے تو اسے بزورِ شمشیر اتباعِ نور کر دیا جائے کہ کم از کم فتنہ و فساد سے تو باز آ جائے۔ اس متعین مقصود کے لیے جو فوجیں جہاد کرتی ہیں، ان کا جہاد فی سبیل النفس نہیں بلکہ فی سبیل اللہ ہوتا ہے اور وہ میدانِ جنگ میں بھی اسی جذبۂ عبادت کے ساتھ جاتی ہیں جس کے ساتھ وہ صحنِ مسجد میں قدم رکھتی ہیں۔ پھر اس میدان میں ان کو اتارنے سے پہلے تزکیۂ نفس اور تطہیرِ اخلاق کے ایک پورے کورس سے انھیں گزارا جاتا ہے۔ انھیں خدا سے پھرے ہوئے لوگوں کی سرکوبی کا کام سکھانے کے ساتھ یہ بھی سکھایا جاتا ہے کہ وہ اپنے نفس کو، اگر خدا سے پھرا ہوا ہو، کس طرح زیر کریں اور دوسروں کو احکامِ الٰہی کا مطیع بنانے سے پہلے خود اپنے آپ کو کس طرح مطیع بنائیں۔ انھیں یہ سکھایا جاتا ہے کہ میدانِ جنگ میں قدم قدم پر خدا کو یاد کرتے ہوئے بڑھیں، عین لڑائی کی حالت تک میں نماز اپنے وقت پر ادا کریں اور دن ان کے گھوڑے یا ٹینک کی پشت پر گزریں تو راتیں مصلے پر۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کی تربیت یافتہ فوج جو ایک پاکیزہ اخلاقی مقصد کے لیے لڑے اور اپنے عقیدہ کے مطابق زمانۂ جنگ کو زمانۂ عبادت سمجھتی ہوئی رقبۂ جنگ میں رہے، اس کی شہوانی ضروریات بھی موجودہ فوجوں کی ضروریات جیسی نہیں ہو سکتیں اور نہ وہ اپنی ان ضروریات کو پورا کرنے میں ان فوجوں کی طرح آزادی کی خواہشمند ہو سکتی ہے۔

اگرچہ بعض روایات کے مطابق زمانۂ جنگ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے متعہ کو جائز رکھا تھا (جسے عرب میں پہلے جائز سمجھا جاتا تھا) لیکن یہ بات ثابت ہے کہ بہت جلدی آپ نے اس کو ممنوع قرار دے دیا۔ اس میں شک نہیں کہ زمانۂ جنگ میں پکڑی ہوئی کنیزوں کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

استعمال کرنے کی اجازت اسلام میں دی گئی ہے، لیکن وہ بھی صرف اس صورت میں ہے جبکہ امام وقت اس کو سپاہیوں میں تقسیم کر کے انھیں سپاہیوں کی ملک قرار دے دے، تاکہ ایک سپاہی کا تعلق جس کنیز یا جن کنیزوں سے ہو، انھیں تک اس کا تعلق شہوانی محدود رہے اور دوسرے کسی شخص کے لیے ان کے ساتھ یہ تعلق جائز نہ ہو، نیز حکومت کے توسط سے قانونی طور پر یہ تعلق قائم ہونے کے بعد سوسائٹی میں یہ بات معلوم و معروف رہے کہ یہ خاص عورت فلاں خاص مرد کی ہے (یعنی وہی فائدہ جو نکاح کا ہے) اس سے یہ امر بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام حالت جنگ میں اپنی فوجوں کی شہوانی ضروریات پوری کرنے کے لیے اخلاقی قیود میں ذرہ برابر بھی کوئی ڈھیل پیدا نہیں کرتا بلکہ اس کے برعکس وہ چاہتا ہے کہ جائز تعلق شہوانی کے مواقع میسر آنے تک وہ ضبط نفس سے کام لیں، خواہ یہ موقع میسر آنے میں کتنے برس لگ جائیں۔ البتہ حدیث کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسانی کمزوریوں کا لحاظ کرتے ہوئے حکومت کا فرض یہ دیکھنا بھی ہے کہ اس کے سپاہی زیادہ مدت تک اپنی عورتوں سے علیحدہ رہنے اور اسی طرح ان کی عورتیں اپنے مردوں سے جدا رہنے کی بنا پر کسی بداخلاقی میں مبتلا نہ ہونے پائیں۔ یہی غرض تھی جس کی خاطر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:-

حرمت نساء المجاھدین علی القاعدین کحرمت امھاتھم — مجاہدین کی بیویاں پیچھے رہنے والے مردوں کے لیے اپنی ماؤں کی طرح حرام ہیں۔

اور یہ کہ:-

ما من رجل من القاعدین یخلف رجلًا من المجاھدین فی اھلہ فیخونہ فیھم الا وقف لہ یوم القیامۃ فیاخذ من عملہ ما شاء — فما ظنکم؟ — جو شخص پیچھے رہنے والوں میں سے کسی مجاہد کی بیوی کے معاملہ میں خیانت کا ارتکاب کرے گا وہ قیامت کے روز اس مجاہد کے سامنے پیش کر دیا جائے گا کہ اس خائن کے اعمال خیر میں سے جو کچھ چاہے لے لے۔ پھر تم کیا گمان کرتے ہو کہ وہ اس کے

اور یہی غرض تھی جس کی وجہ سے حضرت عمرؓ نے ایک مجاہد کی بیوی کو اس کے فراق میں عشقانہ اشعار گاتے ہوئے سن کر یہ حکم دیا تھا کہ سپاہیوں کو اتنی زیادہ طویل مدت تک ان کی بیویوں سے جدا نہ رکھا جائے جس میں ان کے بداخلاقی سے ملوث ہو جانے کا احتمال ہو۔ بالفاظ دیگر فوج میں رخصت (Leave) کا سسٹم اسلامی حکومت میں زیادہ تر اسی غرض کے لیے جاری کیا گیا تھا۔

آپ کا یہ سوال کہ کنیزوں کے استعمال کی اجازت کیا قحبہ گری (Prostitution) کو قانونی جواز دینے کی ہم معنی نہیں ہے؟ یہ معنی رکھتا ہے کہ آپ یا تو قحبہ گری کے معنی سے ذہول برت رہے ہیں، یا کنیزوں سے تمتع کی صحیح حیثیت آپ کے سامنے نہیں ہے۔ قحبہ گری دراصل اس چیز کو کہتے ہیں کہ ایک مرد کسی عورت کا جسم کرایہ پر مستعار حاصل کرے۔ اور شوقیہ قحبہ گری یہ ہے کہ کسی متعین کرایہ کے بغیر (چاہے بوتلوں اور تحفوں کی مقدار مارکیٹ ریٹ سے بہت زیادہ ہی کیوں نہ ہو) یہ مستعار تعلق قائم ہو۔ لیکن کنیز کے ساتھ تمتع سرے سے مستعار ہوتا ہی نہیں، بلکہ جب تک وہ کنیز اس شخص کی ملکیت میں ہے، وہ ایسا ہی ایک مستقل تعلق ہے جیسا زوجین میں ہوا کرتا ہے اور اسی کی رو سے قانوناً اولاد کا نسب اسی طرح ثابت ہوتا ہے جس طرح نکاح سے ثابت ہوتا ہے۔

المہدی کی علامات اور نظامِ دین میں اسکی حیثیت

سوال:- ظہور مہدی کے متعلق آپ نے رسالہ تجدید احیائے دین میں جو کچھ لکھا ہے اس میں اختلاف کا ایک پہلو یہ ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کہ آپ مہدی موعود کے لیے کوئی امتیازی و اختصاصی علامات تسلیم نہیں کرتے، حالانکہ احادیث میں واضح طور پر علامات مہدی کا تذکرہ موجود ہے۔ آخر اس سلسلۂ روایات سے چشم پوشی کیسے کی جاسکتی ہے؟

جواب:۔ ظہور مہدی کے متعلق جو روایات ہیں، ان کے متعلق ناقدین حدیث نے اس قدر سخت تنقید کی ہے کہ ایک گروہ سرے سے اس بات کا قائل ہی نہیں رہا ہے کہ امام مہدی کا ظہور ہوگا۔ اسماء الرجال کی تنقید سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان احادیث کے اکثر روات شیعہ ہیں۔ تاریخ سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر گروہ نے سیاسی و مذہبی اغراض کے لیے ان احادیث کو استعمال کیا ہے اور اپنے کسی آدمی پر ان کی مندرجہ علامات کو چسپاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان وجوہ سے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ نفس ظہور مہدی کی خبر کی حد تک تو یہ روایات صحیح ہیں لیکن تفصیلی علامات کا بیشتر بیان غالباً وضعی ہے اور اہل غرض نے شاید بعد میں ان چیزوں کو اصل ارشاد نبوی پر اضافہ کیا ہے۔ مختلف زمانوں میں جن لوگوں نے مہدئ موعود ہونے کے جھوٹے دعوے کیے ہیں، ان کے لٹریچر میں بھی آپ دیکھیں گے کہ ان کی ساری فتنہ پردازی کے لیے مواد انھیں روایات نے بہم پہنچایا ہے۔

میں نے جہاں تک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشنگوئیوں پر غور کیا ہے، ان کا انداز یہ نہیں ہوتا کہ کسی آنے والی چیز کی علامات و تفصیلات اس طریقے سے کبھی آپ نے بیان کی ہوں جس طرح ظہور مہدی کی احادیث میں پائی جاتی ہیں۔ آپ بڑی بڑی اصولی علامات تو ضرور بیان فرمادیا کرتے تھے، لیکن جزئی تفصیلات بیان کرنا آپ کا طریقہ نہ تھا۔

سوال:۔ ضرورت بعثت مہدی کو "تجدید و احیائے دین" میں تسلیم تو کر لیا گیا ہے، لیکن مہدی کا کیا کام ہوگا، اس مسئلہ کو نقلی تائید کے بغیر محض اپنے لفظوں میں بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ احادیث شریفہ کی روشنی میں اس کی تفصیل کی جائے تو مناسب ہے۔ نیز مہدئ موعود کے مراتب و خصوصیات اور ضرورت اطاعت مہدی وغیرہ پر کوئی بحث نہیں کی گئی ہے، بلکہ عام مجددین میں شمار کر دیا گیا ہے۔ اگرچہ مجدد کامل اور مجدد ناقص کی تقسیم سے یہ معلوم ہوسکتا ہے کہ غالباً یہاں "مجدد" کا لفظ بجائے لغت استعمال ہوا ہے، اصطلاحاً نہیں۔ تاہم جبکہ مجدد معصوم عن الخطا نہیں ہوتا اور مہدئ موعود کو معصوم عن الخطا ہونا ضروری ہے تو پھر اس بیّن فرق کے ہوتے ہوئے مہدئ موعود کو مجدد کی فہرست میں کیسے شمار کیا جاسکتا ہے؟

جواب:۔ اول تو خود لفظ "مہدی" پر غور کرنا چاہیے جو حدیث میں استعمال کیا گیا ہے۔ حضورؐ نے مہدی کا لفظ استعمال فرمایا ہے، جس کے معنی ہیں ہدایت یافتہ کے، "ہادی" کا لفظ استعمال نہیں کیا ہے۔ مہدی ہر وہ سردار، لیڈر، اور امیر ہوسکتا ہے جو راہ راست پر ہو۔ "المہدی" زیادہ سے زیادہ خصوصیت کے لیے استعمال ہوگا جس سے آنے والے کی کسی خاص امتیازی شان کا اظہار مقصود ہے۔ اور وہ امتیازی شان حدیث میں اس طرح بیان کر دی گئی ہے کہ آنے والا خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا نظام درہم برہم ہو جانے اور ظلم و جور سے زمین کے بھر جانے کے بعد از سرِ نو خلافت کو منہاج نبوت پر قائم کرے گا اور زمین کو عدل سے بھر دے گا۔ پس یہی چیز ہے جس کی وجہ سے اس کو مختص و ممتاز کرنے کے لیے "مہدیؑ" پر "ال" داخل کیا گیا ہے۔ لیکن یہ سمجھنا بالکل غلط ہے کہ مہدی کے نام سے دین میں کوئی خاص منصب قائم کیا گیا ہے، جس پر ایمان لانا اور جس کی معرفت حاصل کرنا ویسا ہی ضروری ہو جیسا انبیا پر ایمان لانا، اور اس کی اطاعت بھی شرط نجات اور شرط اسلام وایمان ہو۔ نیز اس خیال کے لیے بھی حدیث میں کوئی دلیل نہیں ہے کہ مہدی کوئی امام معصوم ہوگا۔ در اصل یہ معصومیت غیر انبیاء کا تخیل ایک خالص شیعی تخیل ہے جس کی کوئی سند کتاب و سنت میں موجود نہیں ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ جن چیزوں پر اسلام و کفر کا مدار ہے اور جن پر انسان کی نجات موقوف ہے وہ سب قرآن میں موجود ہیں اور ان کا ثبوت قرآن ہی سے ملنا چاہیے۔ مجرد حدیث پر ایسی کسی چیز کی بنا نہیں رکھی جا سکتی جسے مدار کفر و ایمان قرار دیا جائے۔ احادیث چند انسانوں سے چند انسانوں تک پہنچتی ہوئی آئی ہیں، جن سے حد سے حد اگر کوئی چیز حاصل ہوتی ہے تو وہ گمان صحت ہے نہ کہ علم یقین۔ اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو اس خطرہ میں ڈالنا کبھی پسند نہیں کر سکتا کہ جو امور دین میں اتنے اہم ہیں کہ ان سے کفر و ایمان کا فرق واقع ہوتا ہو، انھیں صرف چند آدمیوں کی روایت پر منحصر کر دیا جائے۔ ایسے امور کو تو اللہ نے خود اپنی کتاب میں بیان کر دیا ہے اور اللہ کے رسول نے انھیں اپنے مشن کا اصل کام قرار دیتے ہوئے ان کی تبلیغ عام کی ہے، حتیٰ کہ وہ بالکل غیر مشتبہ طریقہ سے ہر ہر مسلمان تک پہنچائے گئے۔ پس مہدی کے متعلق خواہ کتنی ہی کھینچ تان کی جائے، بہرحال اس کی یہ حیثیت کبھی قرار نہیں دی جا سکتی کہ اس کے جاننے اور اس پر ایمان لانے کے بغیر کوئی شخص مسلمان نہ ہو سکتا ہو یا بالفاظ دیگر نجات ہی نہ پا سکتا ہو۔ یہ حیثیت اس کی اگر ہوتی تو قرآن میں پوری صراحت کے ساتھ اس کا ذکر کیا جاتا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی دو چار آدمیوں تک نہیں بلکہ پوری امت تک اسے پہنچانے کی سعی بلیغ فرماتے اور اس کی خبر کو اپنے مشن کا ایک جز سمجھتے ہوئے اسے پھیلانے کی کوشش فرماتے۔ یہ کسی طرح سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسی ایک اہم چیز کو اخبار احاد پر چھوڑا جا سکتا تھا اور وہ اخبار احاد بھی اس درجہ کی کہ امام مالک اور امام بخاری اور امام مسلم جیسے لوگ اپنے مجموعہ ہائے احادیث میں سرے سے ان کو لینا بھی پسند نہ کریں۔

خدا کے حضور میں دعا کرتے ہوئے ہاتھ اٹھانا

سوال:۔ میرے متعلق مقامی حلقوں میں چہ میگوئیاں بڑھ رہی ہیں۔ خصوصاً بعد نماز ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے پر بہت لے دے ہو رہی ہے۔ یہاں بہت زیادہ آبادی ایک ایسے خاص مسلک کے پیرووں کی ہے جن کا امتیازی گروہی شعار یہی ہے کہ خدا سے دعا کرتے ہوئے ہاتھ بلند نہ کیے جائیں۔ یہ حضرات اپنے اعتراض کے ساتھ دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ "ادعوا ربکم تضرعا و خفیۃ" کے ارشاد کا تقاضا یہی ہے کہ دعا میں حد درجہ اخفا برتا جائے اور ہاتھ اٹھانے سے اظہار ہوتا ہے۔ بدیں وجہ دعا میں ہاتھ اٹھانا قرآن کے منشا کے خلاف ہے۔ نیز احادیث سے بھی یہ ثابت نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی اس کا التزام کیا ہو۔ اب عوام کو دلائل سے تو کچھ مطلب ہوتا نہیں، وہ لکیر کی فقیری کا مطالبہ کرتے ہیں۔ چنانچہ مجھے صاف صاف کہہ دیا گیا ہے کہ ہمیں ان کی جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کا حق نہیں رکھتا۔ اس حکم کے نافذ کرنے والوں میں بعض حضرات خوب اچھے تعلیم یافتہ بھی ہیں۔ خیر یہ تو جاہلیت کے کرشمے ہیں۔ مجھے صرف مذکورۃ الصدر آیت کی روشنی میں اصل مسئلہ کو سمجھنا ہے۔

جواب:۔ ان حضرات سے یہ دریافت کیجیے کہ "ادعوا ربکم تضرعا و خفیۃ" کا اگر یہی تقاضا ہے جو آپ لوگ سمجھتے ہیں تو یہ نماز کے لیے بلند آواز سے اذان اور پھر علانیہ مسجد میں لوگوں کا جانا، جماعت سے نماز پڑھنا، جہری قرأت کرنا، یہ سب بھی تو آیت کے خلاف ہوں گے، کیونکہ نماز اصل میں تو ایک دعا ہی ہے اور دعا کے لیے اگر اخفا ایسا ہی لازمی ہے کہ اظہار کی کوئی شکل اس میں نہ ہو تو نماز باجماعت کی یہ پوری صورت اس آیت کے خلاف ہو جائے گی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

علاوہ بریں احادیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ہدایت پائی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے جب دعا مانگی جائے تو ہاتھ اٹھا کر مانگی جائے اور دعا سے فارغ ہو کر چہرے پر ہاتھ مل لیے جائیں۔ چنانچہ ابوداؤد، ترمذی اور بیہقی میں اس کے متعلق متعدد روایات موجود ہیں۔ ایک حدیث میں حضرت سلمان فارسیؓ سے روایت ہے کہ ان ربکم حیی کریم یستحیی من عبدہ اذا رفع یدیہ الیہ ان یردھما صفراً یعنی تمہارا رب ایسا باحیا اور کریم ہے کہ جب بندہ اس کی طرف ہاتھ اٹھاتا ہے تو اسے شرم آتی ہے کہ اپنے بندے کو خالی ہاتھ واپس کرے۔ دوسری روایت میں حضرت عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود جب دعا مانگتے تھے تو ہاتھ اٹھا کر مانگتے تھے اور اس کے بعد چہرے پر ہاتھ مل لیا کرتے تھے۔ پھر حاکم نے مستدرک میں حضرت علیؓ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ دعا میں ہاتھ اٹھانا اللہ کے سامنے عاجزی اور مسکنت کے اظہار کے لیے ہے۔

اس کے بعد اگر کوئی شخص ہاتھ اٹھانے پر اعتراض کرتا ہے تو وہ در اصل ایک ایسی چیز پر اعتراض کرتا ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قول اور فعل سے ثابت ہے اور جس کے خلاف بجز قیاس اور گروہ بندی کے تعصب کے اور کوئی چیز نہیں ہے۔ اس قسم کے لوگ اگر خدا سے ڈرتے ہیں تو وہ اپنی گروہ بندیوں اور اپنے گروہی شعاروں کی بہ نسبت سنت کو زیادہ وزنی سمجھیں۔

تاثرات اجتماع (دارالاسلام) کے تحت کچھ سوالات

سوال: میں نے اجتماع کے موقع پر یہ محسوس کیا ہے کہ ہمارے رفقاء میں علمائے اسلام کے خلاف نفرت و حقارت کے جذبات پیدا ہو رہے ہیں۔ اس سے مجھے اندیشہ ہوتا ہے کہ ہم لوگ کہیں تعصب و تحزب میں مبتلا نہ ہو جائیں جیسے کہ پہلے بھی متعدد تحریکیں صحیح خطوط پر چل کر آخر کار فرقہ بندی پر جا ختم ہوئیں۔ اس فتنہ کا بروقت سدباب ہونا چاہیے۔ علماء اپنے رویہ میں ایک حد تک معذور ہیں کیونکہ انھوں نے ایک خاص ماحول میں دماغی تربیت پائی ہے اور ایک خاص طرز فکر سے وہ مسائل کو سوچنے کے عادی ہیں۔ ہمیں ان کی اس معذوری کا لحاظ رکھنا چاہیے۔

جواب: علماء کے متعلق جس رویہ کی شکایت آپ نے کی ہے، وہ یقیناً ایک حد تک پایا جاتا ہے اور میں خود بھی اس کو محسوس کرتا ہوں لیکن ابھی تک میرے نزدیک وہ اپنی فطری حد کے اندر ہے۔ جب دین کے لیے کوئی کام کیا جائے اور وہ بالکل صحیح دینی طرز پر بھی ہو، اعتقادی و عملی حیثیت سے کوئی قباحت بھی اس میں نہ بتائی جا سکے اور کسی لوث یا غرض دنیوی کی نشاندہی بھی اس میں نہ کی گئی ہو اور پھر بھی علماء کی طرف سے اس کا صرف یہی نہیں کہ ساتھ نہ دیا جائے، بلکہ مخالفت کا رویہ اختیار کیا جائے تو میں نہیں سمجھتا کہ اس پر لوگوں کے رنجیدہ ہونے کی آخر کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ اور لوگ جب رنجیدہ ہوں تو ان کے رنج کا اظہار آخر کس شکل میں ہو؟ تاہم میں بروقت اس معاملہ میں چوکنا ہوں اور آپ یقین رکھیں کہ جب کبھی اسے قابل برداشت حد سے بڑھتا دیکھوں گا تو پوری قوت کے ساتھ رد کروں گا

آپ خود چونکہ علماء کے اس گروہ سے وابستگی رکھتے ہیں اور کچھ نہ کچھ عقیدت مندی کی لگاوٹ بھی ابھی تک لگی ہوئی ہے، اس لیے ان حضرات کی غلط روش پر جن لوگوں کو رنج ہے، ان کے رنج پر تو آپ کو شکایت ہے، لیکن خود اس غلط روش پر آپ ان حضرات کو ایک حد تک معذور پاتے ہیں۔ کاش زمانہ کے سینہ میں بھی آپ کا سا دل ہوتا کہ وہ بھی اس قسم کی معذوریوں کا لحاظ کرکے کسی کے ساتھ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رحم کرنے پر تیار ہو جاتا! لیکن آپ یقین رکھیے کہ آپ کے دل میں غلط کاروں کے لیے خواہ کتنے ہی نرم گوشے ہوں، زمانہ ایسے نرم گوشے اپنے سینے میں نہیں رکھتا۔ جو غلطیاں ترکستان، ترکی اور ایران کے علماء نے کیں، ان پر زمانے نے کوئی رعایت نہیں کی اور نتیجہ یہ ہوا کہ علماء کے ساتھ اسلام بھی ڈوب گیا۔ اب جرمنی کی شکست اور روس کی فتح کی بدولت کمیونزم کو وہ طاقت حاصل ہو گئی ہے کہ جس خطرہ کا امکان میں نے سیاسی کشمکش حصہ اول میں ظاہر کیا تھا، وہ بالکل قریب آ پہنچا ہے۔ اب اگر علمائے کرام ہمارے چونکانے سے نہ چونکیں گے اور ہمارے سمجھانے سے نہ مانیں گے تو کمیونزم انھیں چونکائے گا اور افسوس یہ ہے کہ اس وقت چونکنے کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

سوال :- اجتماع میں شرکت کرنے اور مختلف جماعتوں کی رپوٹیں سننے سے مجھے اور میرے رفقا کو اس بات کا پوری طرح احساس ہو گیا ہے کہ ہم نے جماعت کے لٹریچر کی اشاعت و تبلیغ میں بہت معمولی درجہ کا کام کیا ہے۔ اس سفر نے گزشتہ کوتاہیوں پر ندامت اور مستقبل میں کامل عزم و استقلال اور اخلاص کے ساتھ کام کرنے پر آمادہ کر دیا ہے۔ دعا فرمائیں کہ جماعتی ذمہ داریاں پوری پابندی اور ہمت و جرأت کے ساتھ ادا ہوتی رہیں۔

اس امید افزا اور خوش کن منظر کے ساتھ اختتامی تقریر کے بعض فقرے میرے بعض ہمدرد رفقا کے لیے باعث تکدر ہی ثابت ہوئے اور دوسرے مقامات کے مخلص ارکان و ہمدردوں میں بھی بددلی پھیل گئی۔ عرض یہ ہے کہ منکرین خدا کا گروہ جب اپنی بیباکی اور دریدہ دہنی کے باوجود حلم، تحمل اور موعظۂ حسنہ کا مستحق ہے تو کیا یہ دینداروں کا متقشف تنگ نظر طبقہ اس سلوک کے لائق نہیں ہے؟ کیا ان کے اعتراضات و شبہات حکمت و موعظۂ حسنہ اور حلم و بردباری کے ذریعہ رفع نہیں کیے جا سکتے؟۔ اختتامی تقریر کے آخری فقرے کچھ مغلوبیت جذبات کا پتہ دے رہے تھے۔

تقریر کی صحت میں کلام نہیں صرف انداز تعبیر اور طرز بیان سے اختلاف ہے۔ قرآن کا اصول تبلیغ فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللَّهِ لِنتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ " سے اخذ کیا جا سکتا ہے اور اس پر عمل پیرا ہونے سے ساری مشکلات حل ہو سکتی ہیں۔ مجھے اس سے بھی انکار نہیں کہ آپ کی عام عادت تبلیغ و تفہیم میں حکیمانہ ہے۔ اسی بنا پر اس دفعہ خلاف عادت لب و لہجہ کو سخت دیکھ کر تعجب ہوا۔

دوسری گزارش یہ ہے کہ حکمت و مصلحت شرعی کا تقاضا ہے کہ فروعی مسائل اور ظواہر سنن کی تغیر و تبدیل پر ابتداءً اصرار نہ کیا جائے اور نہ خود عملاً ایسا طرز اختیار کیا جائے جس سے مسلمانوں میں توحش و تنفر پیدا ہو۔ اسی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قتل منافقین اور تغییر بنائے کعبہ سے محترز رہے۔ مجھے یہ تسلیم ہے کہ اعفاء اور تقصیر لحیہ کے بارے میں سلف میں اختلاف پایا جاتا ہے اور جو طرز عمل آپ نے اختیار کیا ہے اس کی گنجائش نکلتی ہے۔ ادھر مقدار قبضہ تک اعفاء کے جواز سے آپ کو بھی انکار نہ ہوگا۔ پھر کیا یہ مناسب اور حکیمانہ فعل نہ ہوگا کہ عوام کو توحش سے بچانے کے لیے آپ بھی اسی جواز پر عمل کر لیں، کیونکہ ظاہری وضع قطع میں جو غلو کی صورت ہے، اس کی اصلاح بنیادی امور اور مہمات مسائل کے ذہن نشین کرانے کے بعد بھی ہو سکتی ہے۔ جماعت اسلامی سے مخلصانہ وابستگی اور دلی تعلق کی بنا پر چند سطور لکھ رہا ہوں۔ امید ہے کہ غور فرمائیں گے۔

جواب :- مجھے یہ معلوم کر کے تعجب ہوا کہ آپ اہل مذہب کے ساتھ بھی چاہتے ہیں کہ وہی سلوک کیا جائے جو منکرین کے ساتھ ہونا چاہیے۔ نیز یہ کہ آپ نے فقط نرمی ہی کو تقاضائے حکمت سمجھ رکھا ہے، حالانکہ قرآن و سنت کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حق کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مان لینے والوں سے جب خلافِ حق باتوں کا صدور ہو تو ان کے ساتھ ان لوگوں کی بہ نسبت مختلف برتاؤ کیا جاتا ہے جو سرے سے حق کو نہ ماننے والوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ نیز یہ کہ اللہ اور رسول نے جہاں بعض مواقع پر انتہائی نرمی برتی ہے اور وہ عین مقتضائے حکمت ہے، بعض دوسرے مواقع پر سخت لب ولہجہ بھی اختیار کیا ہے اور تیز و تند الفاظ سے بھی کام لیا ہے اور وہ بھی مقتضائے حکمت ہی رہا ہے۔ میں صرف یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ جو باتیں میں نے آخری تقریر میں کہی ہیں، کیا ان میں کوئی لفظ خلافِ حق تھا؟ نیز یہ کہ اس تقریر میں جو باتیں کہی گئی ہیں، کیا فی الواقع اس مرحلہ پر ان کا کہنا ضروری نہیں تھا؟ اگر ان دونوں میں سے کوئی ایک بات بھی ہو تو آپ اسے ضرور تحریر فرمائیں، لیکن اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ باتیں جو کہی گئی ہیں وہ حق تھیں اور لوگوں کو اصل مقتضیاتِ دین کی طرف توجہ دلانے کے لیے اس وقت انھیں صاف صاف بیان کرنے کی ضرورت بھی تھی تو پھر لب ولہجہ کی شکایت فضول ہے۔ میں آپ کو اس بات کا یقین دلاتا ہوں کہ میں جذبات سے مغلوب ہونے والا آدمی نہیں ہوں۔ نرمی اور سختی جو کچھ بھی اختیار کرتا ہوں، جذبات کی بنا پر نہیں، بلکہ ٹھنڈے دل سے یہ رائے قائم کرنے کے بعد اختیار کرتا ہوں کہ اس موقع پر واقعی ایسا کرنا چاہیے۔

آپ کے سامنے صرف اپنا قریبی ماحول ہے، مگر مجھ پر جس ذمہ داری کا بار ہے، اس کی وجہ سے میں پوری جماعت اور تحریک کے حالات پر نگاہ رکھتا ہوں۔ مجھے یہ اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ اگر اس موقع پر میں مقتضیاتِ دین کو صاف اور واضح طریقہ پر بیان نہ کر دوں اور ان لوگوں کی غلطی کو بالکل کھول کر نہ رکھ دوں جو فروع کو اب تک اصلِ دین بنائے بیٹھے ہیں اور دین کے اصلی تقاضوں سے غفلت برتتے رہے ہیں تو اس کا نتیجہ ہماری تحریک کے حق میں نہایت مہلک ہو گا، کیونکہ اس قسم کا ایک اچھا خاصہ گروہ ہماری تحریک سے محض سطحی طور پر متاثر ہو کر ہماری طرف کھنچنے لگا ہے۔ لیکن اپنے سابق تعصبات اور اپنی سابق غلطیوں میں سے کسی چیز میں بھی ذرہ برابر ترمیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہے بلکہ الٹا ہم سے طالب ہے کہ ہم بھی ان غلطیوں میں مبتلا ہو کر وہی خرابیاں برپا کریں جو یہ لوگ اصلاح کے نام سے کرتے رہے ہیں۔ لہٰذا اگر اس مرحلہ پر میں صاف صاف ان کو متنبہ نہ کر دیتا تو مجھے اندیشہ تھا کہ یہ لوگ جماعت کے اندر آ کر یا جماعت کے دروازہ پر کھڑے ہو کر ایسی پیچیدگیاں پیدا کر دیتے جن سے کام بننے کے بجائے الٹا خراب ہوتا۔ دراصل جو باتیں میری اس تقریر کو سننے کے بعد اس گروہ کے لوگوں نے کی ہیں، ان سے تو مجھے یہ یقین حاصل ہو گیا ہے کہ یہ لوگ فی الواقع دین کے کسی کام کے نہیں اور یہ کہ ان کا ہمارے قریب آنا ان کے دور رہنے بلکہ مخالفت کرنے سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ آپ خود ہی اندازہ کیجیے کہ جو لوگ قرآن وسنت کے لحاظ سے میری تقریر کے اندر کوئی لفظ بھی قابلِ گرفت نہیں بتا سکتے، بلکہ اس کے برعکس جو یہ ماننے پر مجبور ہیں کہ جس چیز کو میں نے دین کا اصل مدعا بتایا ہے، واقعی قرآن وسنت کی رو سے دین کا اصل مدعا وہی ہے اور جن چیزوں کو میں مقدم و موخر کر رہا ہوں وہ واقعی مقدم و موخر ہیں، مگر اس کے باوجود جنھیں میری اس تقریر پر اعتراض کرنے اور بددلی اور رنجش کا اظہار کرنے میں کوئی تامل نہیں ہوتا، وہ آخر کس قدر عزت کے مستحق ہیں کہ ان کے جذبات و خیالات کا لحاظ کیا جائے۔ ایسے لوگ دراصل بندۂ حق نہیں، بلکہ بندۂ نفس ہیں۔ ان کے اندر خدا کا اتنا خوف نہیں ہے کہ اپنی غلطیوں پر متنبہ ہونے کے بعد اپنی اصلاح کریں اور حق کے واضح طور پر سامنے آ جانے کے بعد اسے قبول کریں۔ اس کے بجائے وہ شکایت یہ کرتے ہیں کہ حق بات انھیں صاف صاف کیوں کہہ دی گئی اور کہنے والا انھی تعصبات میں کیوں مبتلا نہیں ہے جن میں وہ خود مبتلا ہیں۔ اس قسم کے لوگ اگر منکرین میں سے ہوتے تو ہم ان کی رعایت کچھ نہ کچھ کر سکتے تھے، مگر یہ لوگ اپنی اس نفس پرستی کے باوجود حق پرستوں کی صفِ اول میں کھڑے ہیں اور دیندار

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ڈھونگ رچاتے ہیں، اس لیے نہ کسی رعایت کے مستحق ہیں اور نہ ایسے لوگوں کے دور ہو جانے پر کوئی ایسا شخص افسوس کر سکتا ہے جو حق کے لیے کام کرنا چاہتا ہے۔ یہ لوگ جو کچھ اب تک مذہب کے نام پر کرتے رہے ہیں، اس سے دین کی کوئی بات بن نہیں آئی ہے بلکہ کچھ بگڑتا رہا ہے۔ اب میں نے چاہا کہ ان کو صاف صاف بتاؤں کہ اگر واقعی دین کی بات بنانا چاہتے ہو تو اس کا طریقہ کیا ہے، اور تمہارے فہمِ دین میں کیا قصور ہے جس کی وجہ سے تم اب تک کچھ نہیں کر سکے۔ اگر یہ لوگ واقعی دین کے ساتھ کوئی قلبی تعلق رکھنے والے ہوتے تو میری باتیں سن کر ان کی آنکھیں کھل جاتیں اور ان کے اندر توبہ و انابت کا جذبہ پیدا ہوتا، لیکن اس کے بجائے یہ لوگ الٹا مجھ سے بگڑ گئے اور اب بھی ان کے نزدیک مرجح یہی ہے کہ انہی تعصبات اور جزئیات پرستیوں میں مبتلا رہیں جن میں اب تک مبتلا رہے ہیں۔ ان کی اس کیفیت کو دیکھ لینے کے بعد میں بہت خوش ہوں اور خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ یہ فتنہ پسند گروہ قریب آنے کے بجائے دور جا رہا ہے۔

اگر خدا نخواستہ میں اس اجتماع کے موقع پر ان باتوں کو صاف صاف بیان کرنے میں کوئی کسر اٹھا رکھتا تو البتہ یہ میری ایسی کوتاہی ہوتی جس پر میں بعد میں افسوس کرتا۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ خود ان لوگوں کو یہ توفیق ہی نہیں دینا چاہتا کہ یہ لوگ اس کے دین کی کوئی خدمت کریں۔ جن فتنوں کی یہ خدمت کرتے رہے ہیں، اللہ نے بھی غالباً یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ ان کو انہی فتنوں کی توفیق عطا فرماتا رہے۔

ڈاڑھی کے متعلق جو آپ نے تحریر فرمایا ہے اس کے متعلق یہ گذارش ہے کہ میں اپنے عمل سے اس ذہنیت کو غذا دینا پسند نہیں کرتا جس نے بدعت کو عین سنت بنا دینے تک نوبت پہنچا دی ہے۔ میرے نزدیک کسی غیر منصوص چیز کو منصوص کی طرح قرار دینا اور کسی غیر مسنون چیز کو (جو اصطلاحِ شرعی کے لحاظ سے سنت نہ ہو) سنت قرار دینا بدعت ہے اور ان خطرناک بدعتوں میں سے ہے جو معلوم و معروف بدعتوں کی بہ نسبت زیادہ تحریفِ دین کی موجب ہوتی ہیں۔ اسی قبیل سے یہ ڈاڑھی کا معاملہ ہے۔ لوگوں نے غیر منصوص مقدار کو ایسی حیثیت دے دی ہے اور اس پر ایسا اصرار کرتے ہیں جیسا کسی منصوص چیز پر ہونا چاہیے، پھر اس سے زیادہ خطرناک غلطی یہ کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت کو بعینہٖ وہ سنت قرار دیتے ہیں جس کے قائم و جاری کرنے کے لیے آپ مبعوث ہوئے تھے، حالانکہ جو امور آپ نے عادۃً کیے ہیں انھیں سنت بنا دینا اور تمام دنیا کے انسانوں سے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ سب ان عادات کو اختیار کریں، اللہ اور اس کے رسول کا ہرگز یہ منشا نہ تھا۔ یہ تحریف جو دین میں کی جا رہی ہے، اگر میں اس کے آگے سپر ڈال دوں اور جس وضع اور قطع میں لوگ مجھے دیکھنا چاہتے ہیں، اس میں اپنے آپ کو ڈھال لوں تو میرے نزدیک میں ایک ایسے جرم کا مرتکب ہوں گا جس کے لیے اللہ کے یہاں مجھ سے سخت بازپرس ہوگی اور اس بازپرس میں کوئی میری مدد کے لیے نہ آسکے گا۔ لہٰذا میں اپنے آپ کو لوگوں کے مذاق کے خلاف بنائے رکھنا بدرجہا بہتر سمجھتا ہوں، بجائے اس کے کہ اپنے آپ کو اس اخروی خطرے میں ڈالوں۔

سوال:- حالیہ اجتماعِ دارالاسلام کے بعد میں نے زبانی بھی عرض کیا تھا اور اب بھی اقامتِ دین کے فریضہ کو فوق الفرائض بلکہ اصل الفرائض اور اسی راہ میں جدوجہد کرنے کو تقوی کی روح سمجھنے کے بعد عرض ہے کہ "مظاہرِ تقویٰ" کی اہمیت کی نفی میں جو شدت آپ نے اپنی اختتامی تقریر میں برتی تھی وہ ناتربیت یافتہ ارکینِ جماعت میں "عدم اعتنا بالسنۃ" کے جذبات پیدا کرنے کا موجب ہوگی اور میں دیانۃً عرض کرتا ہوں کہ اس کے مظاہر میں نے بعد از اجلاس ملاحظہ کیے۔ اس شدت کا نتیجہ بیرونی حلقوں میں اور فی الواقع یہ ہوگا کہ تحریک کو مشکوک نگاہوں سے دیکھا جائے گا، کیونکہ اس سے پہلے بھی بعض داعیین تحریکات "استہزا بالسنۃ" کی ابتدا اسی طرح کی تھی کہ بعض مظاہر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تقویٰ کو اہمیت دینے اور ان کا مطالبہ کرنے میں شدت اختیار کرنے کی مخالفت جوش و خروش سے کی۔ دوسرے یہ کہ شرارت پسند عناصر کو ہم خود گویا ایک ایسا ہوائی پستول فراہم کر دیں گے جو چاہے درحقیقت گولی چلانے کا کام ہرگز نہ کر سکے مگر اس کے فائر کی نمائشی آواز سے حق کی طرف بڑھنے والوں کو بدکایا جا سکے گا۔ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح کے معاملات میں عوام کے مبتلائے فتنہ ہو سکنے کا لحاظ رکھا ہے۔ چنانچہ بیت اللہ کی عمارت کی اصلاح کا پروگرام حضورؐ نے محض قوم کی جہالت اور جدید العہد بالاسلام ہونے کے باعث ملتوی کر دیا تھا اور پھر اتنی احتیاط برتی کہ کبھی کسی وعظ اور خطبہ میں لوگوں کو اس کی طرف توجہ تک نہیں دلائی۔ بجز اس کے کہ دوران نماز حضرت عائشہ صدیقہؓ سے آپ نے اس کا تذکرہ ایک دفعہ کیا۔

علاوہ بریں مظاہر تقویٰ کے معاملہ میں بھی دوسرے مسائل کی طرح خود داعی و مصلح اول صلوٰۃ اللہ علیہ کے ذاتی اسوہ کا اتباع ہی راہ ہدایت ہے۔ اس امر کو تسلیم کرنے کے بعد یہ روایت مدنظر رکھیے کہ "کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کث اللحیۃ بملا صدرہ" اس اسوۂ رسول کا اتباع کرتے ہوئے اگر آپ افراط و تفریط کی اصلاح کریں تو پھر ادھر تو معترضین کو عیب چینی کے مواقع کم ملیں گے اور اُدھر مغربیت زدہ لوگوں کے لیے طغیان نفس و اباء اطاعت کے لیے کمتر مواقع حاصل ہوں گے۔ اسی بنا پر میں نے بوقت ملاقات عرض کیا تھا کہ آپ کا ذاتی تعامل باعفاء اللحیہ و دیگر پہلوؤں سے تکمیل ظواہر سنن بالیقین دین کے لیے مفید ہوگا۔ اس کا خیال رہے کہ ادھر مذہبی مخالفین کا گروہ ہے جس کی اصلاح اس انداز سے کرنی ہے کہ مختلف امور دین کو ان کے اصل مقام پر رکھ کر انھیں ان کی صحیح حیثیت اور ان کی صحیح اہمیت سے آگاہ کرنا ہے۔ لیکن دوسری طرف جدید تعلیم یافتہ طبقہ ہے جس کے نزدیک مظاہر تقویٰ کے معاملہ میں سنت انبیاء خصوصاً داڑھی کی سنت کا اتباع کرنا نہ صرف غیر ضروری، بلکہ ذریعۂ نفرت و تمسخر ہے۔ اس گروہ کی اصلاح بھی تو آخر ہمارے ہی ذمہ ہے، تو پھر کیا یہ فرض پورا کرنے کے لیے وہی اتباعی شدت زیادہ کارآمد نہیں ہے جو مظاہر تقویٰ کے تحفظ میں قدیم دیندار طبقہ کی تنقید کی روح تھی؟

مزید یہ کہ ہم اسلام کی اساسی حقیقتوں ہی کو جب پوری وسعت سے نہیں پھیلا چکے ہیں اور ابھی بے شمار بندگانِ خدا کے سینوں میں اترنے کی مہم سر کرنی باقی ہے تو کیا بہتر یہ نہ ہوگا کہ ہم فروعی امور کے کانٹوں سے دامن بچا کر بڑھتے جائیں اور اصل مقصد کی طرف بڑھتے ہوئے اپنا ایک لمحہ بھی ضائع نہ ہونے دیں۔ ورنہ مجھے خطرہ ہے کہ ہم لوگ جن کا دن رات وظیفہ متلاشیانِ اعوجاج و متبغیانِ فتنہ و تاویل سے ہے، صرف انھیں زائد از ضرورت مسائل میں الجھ کر رہ جائیں گے اور اصل مقصد فوت ہو جائے گا۔ پس بہتر یہی ہے کہ "مظاہر تقویٰ" وغیرہ قسم کے مباحث پر تحریروں اور تقریروں میں درشت اور شدید طریقے سے بحث نہ کی جائے۔

جواب: آپ نے جو امور تحریر فرمائے ہیں ان میں سے بیشتر کے جواب میں نے زبانی عرض کر دیے تھے اور اب بھی اپنے ان زبانی جوابات پر کسی اضافہ کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ تاہم ایک دو امور اس سلسلہ میں ایسے ہیں جن پر مختصراً کچھ اشارہ کرنا کافی سمجھتا ہوں۔ آپ نے بار بار اس بات کا اظہار کیا ہے کہ مظاہر تقویٰ کے متعلق میں نے کوئی شدت برتی ہے جو سنت کے استہزا کی تمہید بن سکتی ہے اور بعض لوگوں کے لیے سنت سے بے اعتنائی کی موجب ہوئی ہے۔ کیا آپ براہ کرم یہ بتا سکتے ہیں کہ وہ کون سے الفاظ تھے جن کو آپ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شدت سے تعبیر کرتے ہیں۔ اگر الفاظ آپ کو یاد نہ ہوں تو آپ تھوڑا صبر فرمائیں، میں اپنی اس تقریر کو قلمبند کرا کے ان شاء اللہ عنقریب شائع کردوں گا اس وقت آپ اسے پڑھ لیجیے گا اور میرے وہ الفاظ نشان لگا کر میرے پاس بھیج دیجیے گا جن میں شدت پائی جائے[1]۔ اسی طرح جن ارکین سے آپ کا تبادلۂ خیال ہوا اور آپ نے یہ محسوس کیا کہ میری اس تقریر کی بدولت ان میں سنت سے عدم اعتناء پیدا ہوا ہے، اگر آپ کو ان کے نام یاد ہوں یا کم سے کم یہی یاد ہو کہ وہ کس جگہ کی جماعت سے تعلق رکھتے تھے تو مجھے لکھ دیجیے تاکہ میں پوری طرح تشخیص کر سکوں کہ آیا ان کے متعلق آپ کا اندازہ غلط تھا یا میرے متعلق ان کا اندازہ۔

کیا آپ نے کبھی اس بات پر بھی غور کیا ہے کہ اس جماعت میں داخل ہونے کے بعد جن لوگوں کے چہرے پر داڑھی آئی ہے، اتباع سنت کی تبلیغ کا دعویٰ رکھنے والے حضرات میں سے کسی کی تبلیغ سے ان کے چہرے کبھی داڑھی سے مزین نہیں ہو سکتے تھے حالانکہ جماعت میں آنے کے بعد ہم نے کبھی ان سے داڑھی یا دوسرے مظاہر تقویٰ کے متعلق اشارۃً بھی نہیں کہا کہ وہ فلاں چیز پر عمل کریں۔ باوجود اس کے ان لوگوں نے جو کبھی خواب میں بھی یہ دیکھنے کے لیے تیار نہ تھے کہ ان کے چہرے پر داڑھی ہو، خود بخود داڑھیاں رکھ لیں اور اپنے فیشن تبدیل کرنے شروع کر دئے۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ ہم نے اسی اصل چیز کی تعلیم و تلقین پر سارا زور صرف کیا جو پوری دیندارانہ زندگی کی جڑ ہے، یعنی خدا اور رسول کی وفاداری و اطاعت۔ اس کے بعد ہمیں کسی چیز کی الگ الگ تلقین کی ضرورت نہ رہی۔ جس جس بات کے متعلق ان کو معلوم ہوتا گیا کہ خدا و رسول کا حکم یہ ہے یا خدا اور رسول کو یہ پسند ہے، اسے اختیار کرنے پر وہ اپنے نفس کو مجبور کرتے چلے گئے اور جس جس کے متعلق یہ معلوم ہوتا گیا کہ یہ خدا اور رسول کو ناپسند ہے، اسے وہ خود بخود چھوڑتے چلے گئے۔ اس سلسلے میں ان کے اندر وہی تبدیلیاں نہیں ہوئیں جو آپ لوگوں کے نزدیک اتباع سنت رہی ہیں، بلکہ وہ تبدیلیاں بھی ہوئیں جن کے متقضی دین ہونے کے تصور سے بہت سے دورِ آخر کے پیشوایانِ دین تک خالی رہے ہیں۔ یہ سب کچھ دیکھ لینے کے بعد جب آپ مجھ سے کہتے ہیں کہ تیری باتوں سے لوگوں میں سنت سے عدم اعتناء اور استہزاء کی کیفیت پیدا ہوگئی یا ہوئی تو مجھے حیرت بھی ہوتی ہے اور افسوس بھی ہوتا ہے۔ میں نے تو مجبور ہو کر بلکہ تنگ آکر صاف صاف بات اس وقت کہی ہے جب کہ ایک گروہ نے اپنے طرزِ عمل سے مجھ پر یہ ثابت کر دیا کہ ایک طرف وہ ہماری دعوت پر لبیک کہتا ہوا آگے بھی بڑھتا ہے اور دوسری طرف جزئیات کو اصول و کلیات پر مقدم رکھنے اور تقریر، تحریر اور بحث و جدال کا سارا زور انھیں پر صرف کرنے کی پرانی بیماری بھی اس کو لگی ہوئی ہے۔ اس سے مجھے خطرہ ہوا کہ اس بیماری کو لیے ہوئے اگر یہ گروہ جماعت میں آگیا تو یہاں پھر وہی سب کچھ ہونے لگے گا جو باہر مذہبی میدان میں ہوتا رہا ہے۔ اس لیے مجھے مجبوراً یہ بتا دینا پڑا کہ ایسے لوگ ہمارے کسی کام کے نہیں ہیں اور ہماری دعوت کا مزاج ان کی افتادِ مزاج سے بالکل مختلف ہے۔ وہ اگر اپنے دماغ کی اصلاح کر کے اور اپنے فہمِ دین کو درست کر کے آنا چاہیں تو چشم ما روشن، دل ما شاد! لیکن اگر وہ جماعت میں آکر یا جماعت میں رہ کر وہی سب کچھ کرنا چاہتے ہیں جو اس سے پہلے کرتے رہے ہیں اور جس کی بدولت دین کا کچھ کام بنانے کے بجائے کچھ بگاڑتے ہی رہے ہیں تو بہتر ہے کہ وہ ہماری اس جماعت کو خراب کرنے کے بجائے اپنے پرانے مشاغل باہر ہی رہ کر جاری رکھیں۔

اس وجہ سے جو کچھ میں نے کیا اور جو کچھ میں نے کہا، خوب سوچ سمجھ کر ہی کیا اور کہا۔ خدا کے فضل سے میں کوئی کام یا کوئی بات جذبات سے مغلوب ہو کر نہیں کیا اور کہا کرتا۔ ایک ایک لفظ جو میں نے اپنی تقریر میں کہا ہے، تول تول کر کہا ہے اور یہ سمجھتے ہوئے کہا ہے

---

[1] وہ تقریر اسی اشاعت میں بسلسلۂ روداد اجتماع درج ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کہ اس کا حساب مجھے خدا کو دینا ہے، نہ کہ بندوں کو۔ چنانچہ میں اپنی جگہ بالکل مطمئن ہوں کہ میں نے کوئی ایک لفظ بھی خلاف حق نہیں کہا اور جو کچھ کہا اس کا کہنا خدمت دین کے اس مرحلے پر ناگزیر تھا۔ اس کے کہنے پر نہیں، بلکہ نہ کہنے پر مجھے اندیشہ تھا کہ میں ماخوذ ہوں گا۔ اب بھی جو باتیں آپ نے تحریر فرمائی ہیں ان میں بھی کوئی ایک چیز ایسی نہیں ہے جس سے مجھے اپنی اس رائے میں ترمیم کرنے کی ضرورت پیش آئے۔

میں نے آپ سے زبانی بھی عرض کیا تھا اور اب تحریراً بھی عرض کرتا ہوں کہ میں دین کو جو کچھ سمجھتا ہوں اور شریعت کے متعلق جو کچھ مجھے علم ہے، اس کی بنا پر میرا یہ فرض ہے کہ نہ صرف اپنے قول سے، بلکہ اپنے عمل سے بھی ان غلطیوں کی اصلاح کروں جو شریعت کے بارے میں لوگوں کے اندر پھیلی ہوئی ہیں۔ محض لوگوں کے مذاق کی رعایت کرتے ہوئے اپنے آپ کو اس رنگ میں پیش کرنا جس میں وہ مجھے رنگا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں اور ان کو اس غلط فہمی میں ڈالنا کہ شریعت کے اصل تقاضے وہی ہیں جو انھوں نے سمجھ رکھے ہیں، میرے نزدیک گناہ ہے۔ میں اسوہ اور سنت اور بدعت وغیرہ اصطلاحات کے ان مفہومات کو غلط، بلکہ دین میں تحریف کا موجب سمجھتا ہوں جو بالعموم آپ حضرات کے ہاں رائج ہیں۔ آپ کا یہ خیال کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جتنی بڑی داڑھی رکھتے تھے، اتنی ہی بڑی داڑھی رکھنا سنت رسول یا اسوۂ رسول ہے، یہ معنی رکھتا ہے کہ آپ عادات رسول کو بعینہٖ وہ سنت سمجھتے ہیں جس کے جاری اور قائم کرنے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے انبیا علیہم السلام مبعوث کیے جاتے رہے ہیں۔ مگر میرے نزدیک صرف یہی نہیں کہ یہ سنت کی صحیح تعریف نہیں ہے، بلکہ میں یہ عقیدہ رکھتا ہوں کہ اس قسم کی چیزوں کو سنت قرار دینا اور پھر ان کے اتباع پر اصرار کرنا ایک سخت قسم کی بدعت اور ایک خطرناک تحریف دین ہے جس سے نہایت برے نتائج پہلے بھی ظاہر ہوتے رہے ہیں اور آئندہ بھی ظاہر ہونے کا خطرہ ہے۔

آپ کو اختیار ہے کہ میری اس رائے سے اتفاق نہ کریں، لیکن جب تک میں اپنے مطالعۂ کتاب و سنت کی بنا پر یہ رائے رکھتا ہوں، اس وقت تک آپ لوگوں کا یہ مطالبہ کرنا کہ میں اپنے عقیدہ و علم کے خلاف آپ لوگوں کی مزعومہ سنتوں کو اختیار کروں کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ اور ایسا نہ کرنے کی صورت میں آپ لوگ جب مجھے یہ اندیشہ دلاتے ہیں کہ لوگ مجھ سے بدگمان ہوں گے اور یہ چیز ان کے دعوت کی طرف آنے میں مانع ہوگی تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ لوگ میری دعوت الی اللہ کے جواب میں مجھ کو الٹی دعوت الی الناس دینا چاہتے ہیں۔ جن لوگوں کے اندر حق اور غیر حق کی اتنی تمیز بھی باقی نہ رہی ہو کہ وہ یہ بھی نہ سمجھ سکیں کہ میں جس چیز کی طرف انھیں بلا رہا ہوں، وہ دین میں کیا مقام رکھتی ہے اور وہ جن باتوں کی وجہ سے میری دعوت کو قبول کرنے میں تامل یا انکار کر رہے ہیں ان کا دین میں کیا درجہ ہے، ایسے ناحق شناس اور ظاہر پرستی کے مجلس میں اپنے تخیلات کو پوجنے والے لوگ آخر کس وزن اور قدر کے مستحق ہیں کہ ان کے جذبات اور ان کے خیالات کی کوئی رعایت کی جائے۔

سوال:۔ اسی سلسلہ میں ایک اور اہم چیز کی طرف توجہ دلانے پر مجبور ہوں۔ اگرچہ وہ "بڑی بات" ہی ہے اور یہ جرأت کرتے وقت "خود را شناس" کا آوازہ سن رہا ہوں، لیکن نصب العین کی محبت کا غلبہ کہنے پر مجبور کرتا ہے۔ میں توقع رکھتا ہوں کہ اگر اس جسارت پر ملال ہو تو معاف کیا جاؤں وذالک ھو المرجو من کرمکم — اور وہ یہ ہے کہ اسوۂ داعی الی اللہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیمات اپنے رفقاء سے یوں تھا کہ "کان ھو کاحدھم" یا "عزیز علیہ ما عنتم" نیز "حریص علیکم" اور "بالمومنین رؤف الرحیم"۔ اس حیثیت میں موجودہ بے بنت زمانہ کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تمنا کی جا رہی ہے۔ اللھم ارزقنا حبك وحب من یحبك

جواب :- آپ نے جو امور خط کے اس دوسرے حصہ میں تحریر فرمائے ہیں، میں چاہتا ہوں کہ آپ ان کی ذرا کچھ تفصیل ارشاد فرمائیں۔ میں نے اپنی حد تک اس بات کی پوری کوشش کی ہے کہ جماعت کے لوگوں میں میں اس طرح رہوں اور ایسا رویہ رکھوں جس میں امتیاز کی بو تک نہ ہو اور میرے اور ان کے درمیان وہی مساوات پائی جائے جو اسلام کا تقاضا ہے، لیکن مجھے یہ معلوم ہے کہ ایک گروہ میں ایسی مساوات کی خواہش رہی ہے جو نہ دین کا تقاضا ہے اور نہ عملاً وہ ممکن ہے۔ اور ایسی مساوات نہ ہونے پر ان کے اندر بددلی و بے اطمینانی پیدا ہوتی رہی ہے۔ مجھے شبہ ہوتا ہے کہ اس بددلی اور بے اطمینانی کی بنا پر جو پروپیگنڈا کیا جا رہا ہے اور جس کا مرکز...... بھی رہا ہے، شاید اس کے اثرات آپ تک بھی پہنچے ہیں۔ اگر ایسی کوئی چیز مدنظر ہو تو اس کے لکھنے کی ضرورت نہیں ہے، لیکن اگر آپ نے کوئی ایسی چیز پائی ہے جو تقاضائے دین و شریعت تھی اور اس کے لحاظ سے میرے طرز عمل میں کوئی کوتاہی آپ کو نظر آئی ہے تو اس سے مجھے ضرور مطلع فرمائیے تاکہ میں اس کی اصلاح کر سکوں۔ جہاں تک دین و شریعت کے مطالبات ہیں ان کو پورا کرنا میرا فرض ہے اور ان کے لحاظ سے کسی قصور و کوتاہی میں مبتلا ہونا میں گناہ سمجھتا ہوں، لیکن میرے لیے یہ بات سخت تکلیف کی موجب ہے کہ بہت سے لوگ مجھ سے اپنی خواہشات کا اتباع کرانا چاہتے ہیں اور اسے رسول اللہ کے نام سے کرتے ہیں۔

داڑھی کی مقدار کا مسئلہ

سوال :- داڑھی کی مقدار کے عدم تعین پر "ترجمان" میں جو کچھ لکھا گیا ہے، اس سے مجھے تشویش ہے، کیونکہ بڑے بڑے علماء کا متفقہ فتویٰ اس پر موجود ہے کہ داڑھی ایک مشت بھر لمبی ہونی چاہیے اور اس سے کم داڑھی رکھنے والا فاسق ہے۔ آپ آخر کن دلائل کی بنا پر اس "اجماعی فتویٰ" کو رد کرتے ہیں؟

جواب :- یہ تو انھیں علماء سے پوچھنا چاہیے کہ ان کے پاس مقدار کے تعین کے لیے کیا دلیل ہے؟ اور خصوصاً "فسق" کی وہ آخر کیا تعریف کرتے ہیں جس کی بنا پر ان کی تعین کردہ مقدار سے کم داڑھی رکھنے والے پر فاسق کا اطلاق ہو سکتا ہے؟ مجھے سخت افسوس ہے کہ بڑے بڑے علماء "خود حدود شرعیہ" کو نہیں سمجھتے اور ایسے فتوے دیتے ہیں جو صریحاً حدود شرعیہ سے متجاوز ہیں۔

داڑھی کے متعلق شارع نے کوئی حد مقرر نہیں کی ہے۔ علماء نے جو حد مقرر کرنے کی کوشش کی ہے، وہ بہرحال ایک استنباطی چیز ہے اور کوئی استنباط کیا ہوا حکم وہ حیثیت حاصل نہیں کر سکتا جو نص کی ہوتی ہے۔ کسی شخص کو اگر فاسق کہا جا سکتا ہے تو صرف حکم منصوص کی خلاف ورزی پر کہا جا سکتا ہے۔ حکم مستنبط کی خلاف ورزی (چاہے استنباط کیسے ہی بڑے علماء کا ہو) فسق کی تعریف میں نہیں آتی، ورنہ اسے فسق قرار دینے کے دوسرے معنی یہ ہوں گے کہ استنباط کرنے والوں کی بھی شریعت میں وہی حیثیت ہے جو خود شارع کی ہے۔

سوال :- کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ کسی صحابی کی داڑھی ایک مشت سے کم تھی؟

جواب :- اسماء الرجال اور سیر کی کتابوں میں تلاش کرنے سے مجھے بجز دو تین صحابیوں کے کسی کی داڑھی کی مقدار نہیں معلوم ہو سکی ہے۔ صحابہ کے حالات پر صفحے کے صفحے لکھے گئے ہیں مگر ان کے متعلق یہ نہیں لکھا گیا کہ ان کی داڑھی کتنی تھی۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سلف میں یہ مقدار کا مسئلہ کتنا غیر اہم اور ناقابل توجہ تھا۔ حالانکہ متاخرین میں جس شدت سے اس پر زور دیا جا رہا ہے اس سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید مومن کی سیرت و کردار میں پہلی چیز جس کی جستجو ہونی چاہیے وہ یہی ہے کہ اس کی داڑھی کا طول کتنا ہے۔

سوال: داڑھی کی مقدار کے عدم تعین کا جو مسئلہ ہماری جماعت میں پھیل نکلا ہے، اس کے ماتحت بعض رفقاء نے اپنی داڑھیاں پہلے سے چھوٹی کرائی ہیں اور اب ان خشخشی داڑھیوں کے متعلق یہ خطرہ ہے کہ کہیں "احمدی داڑھی" کی طرح ان بھی کوئی فرقی نام نہ پڑ جائے اور عوام کے لیے یہ چیز فتنہ ثابت ہو۔ چونکہ علما کا متواتر تعامل مشت بھر داڑھی رکھنے کا ہے، اس وجہ سے میرا خیال یہ ہے کہ ہمیں بھی اسی کا التزام کرنا چاہیے۔

جواب: آپ کا قلب جس چیز کے اوپر گواہی دے، آپ کو خود اس پر عمل کرنا چاہیے، لیکن اسی چیز کو دوسروں کے لیے ضابطہ بنانے کی خواہش نہ ہونی چاہیے۔ میرے نزدیک کسی کی داڑھی کے چھوٹا یا بڑا ہونے سے کوئی خاص فرق واقع نہیں ہوتا۔ اصل چیز جو آدمی کے ایمان کی کمی اور بیشی پر دلالت کرتی ہے وہ تو اور ہی ہے۔ البتہ مجھے یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ جس طرح ایمان کی کمی کو بعض ظاہری چیزوں کی بیشی سے پورا کرنے کی اب تک کوششیں کی جاتی رہی ہیں، کہیں ہماری جماعت کے بھی کچھ لوگ اسی مرض میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ اگر کسی کی حقیقی جاں نثاری و وفاداری اللہ کی راہ میں "طویل" ہو تو کوئی بڑا نقصان نہ ہو جائے گا، اگر اس کی داڑھی "قصیر" ہو۔ لیکن اگر جاں نثاری و وفاداری "قصیر" ہے تو یقین رکھیے کہ داڑھی کا طول کچھ بھی فائدہ نہ دے گا۔ بلکہ بعید نہیں کہ خدا کے ہاں اس پر فریب کاری اور مکاری کا مقدمہ چل جائے۔

آپ اس کی فکر نہ کیجیے کہ ہماری جماعت کے ارکان کے متعلق لوگ کیا رائے قائم کریں گے اور ان کے ظاہر سے کیا اثر لیں گے۔ آپ کو اور ہمارے تمام رفقاء کو اپنے باطن کی فکر اپنے ظاہر سے بڑھ کر ہونی چاہیے اور اسی طرح اپنے ان اعمال کی زیادہ فکر کرنی چاہیے جن پر خدا کی میزان میں آدمی کے ہلکے یا بھاری ہونے کا مدار ہے، کیونکہ اگر ایسے اعمال ہلکے رہ گئے تو بال برابر وزن رکھنے والی چیزوں کی کمی و بیشی سے میزانِ الٰہی میں کوئی خاص فرق واقع ہونے کی توقع نہیں ہے۔

مسلک تشیع اور ترجمان القرآن

سوال: ترجمان القرآن یوں تو اعلیٰ درجہ کا دینی پرچہ ہے، مگر شیعوں کے اعتراضات اور غلط خیالات کی تردید اس میں نہیں ہوتی۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب: ترجمان القرآن کوئی فرقہ وارانہ پرچہ نہیں ہے کہ وہ مناظروں کا میدان بنا رہے۔ اس کا مقصد اشاعت تحریک اسلامی کو اس کی اصلی شکل میں زندہ کرنا ہے اور وہ ایک اثباتی دعوت کا علمبردار ہے۔ اس اثباتی دعوت کے خلاف نیک نیتی سے جو شکوک و شبہات اور اعتراضات پیش کیے جاتے ہیں، چاہے وہ شیعوں کی طرف سے ہوں یا سنیوں کی طرف سے، اہل حدیث انھیں پیش کریں یا حنفی، اسی طرح مسلمان اس کی دعوت کو سمجھنے کے لیے کوئی استفسار کریں یا ہندو اور سکھ، سبھی کا جواب دیا جاتا ہے۔ مگر فرقہ وارانہ عصبیت رکھنے والے پرچوں کی طرح یہ صورت یہاں نہیں ہے کہ اصل دین چاہے کتنا ہی ساقط الاعتبار ہوتا چلا جائے، اس کے معاملے سے قطع نظر کر کے فقہی اور کلامی جزئیات پر محض نظری بحث کجتی کا سلسلہ جاری رہے۔

ہماری اثباتی دعوت خود ہی مختلف فرقِ باطلہ کے غلط نظریات پر شدید ضرب لگاتی ہے۔ ابطال باطل کے اس ایجابی طریقہ کو چھوڑ کر اگر سلبی انداز اختیار کیا جائے تو آخر کس کس گروہ کے عقیدۂ فاسد اور عمل باطل کے خلاف ہم لڑتے رہیں گے۔ اس طرح تو غالباً دس صدی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بھی حصول مقصد کے لیے ناکافی ہوں گی۔ سیدھی بات ہے کہ جب ہم تعین سے یہ کہتے ہیں کہ حق صرف یہ ہے تو اس سے از خود یہ بات اخذ ہوتی ہے کہ اس "یہ" کے خلاف جو کچھ ہے باطل ہے۔

سوال:۔ حکومت الٰہیہ میں شیعوں کی حیثیت کے متعلق ایک سوال کا جو جواب ترجمان القرآن میں شائع ہوا ہے، اس کا مقصد میں نہیں پا سکا ہوں۔ کیونکہ ایک طرف آپ نے خود ہی یہ تسلیم کیا ہے کہ دورِ رسالت سے خلافتِ راشدہ تک مسلمان ایک ہی گروہ تھے اور کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ سے فرقوں کا وجود ہی ثابت نہیں، لیکن دوسری طرف مذکورہ بالا جواب سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ اہل تشیع اور دوسرے گمراہ فرقوں کو دائرۂ اسلام ہی میں رکھتے ہیں۔

براہ کرم اپنے نظریہ کی وضاحت فرمایئے، اور یہ بھی لکھیے کہ اصولی اختلافات سے آپ کی کیا مراد ہے۔

جواب:۔ میں نے اپنے اس جواب میں یہ تو صاف صاف واضح کر دیا ہے کہ قرونِ اولیٰ میں اصولی اختلاف رکھنے والے فرقوں کا وجود نہ تھا اور نہ اسلام یعنی کتاب اللہ اور سنت نبوی نے انھیں گوارا کیا ہے۔ اس سے خود بخود یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اصولی اختلاف کی بنا پر جو فرقہ بھی بنے گا، وہ امت مسلمہ کا جز شمار نہیں ہوگا۔ رہا یہ سوال کہ ایسے فرقوں کو عملاً حکومت الٰہیہ کے زیر سایہ کیا حیثیت دی جائے گی (یعنی انھیں اہل کتاب میں شمار کیا جائے گا یا ذمیوں میں) تو یہ سوال دراصل اس وقت کا ہے ہی نہیں۔ یہ سوال جب عملاً پیش آئے گا تو اس کا حل بھی ان شاء اللہ ہو ہی جائے گا۔ قبل از وقت آخر کیوں ایک فرقہ سے اس کی حیثیت کے متعلق بحث کے دروازے کھول کر وقت ضائع کیا جائے۔

اصولی اختلاف سے ہماری مراد یہ ہے کہ عقیدۂ توحید، حیثیتِ رسالت اور نظریۂ معاد کو جس طرح قرآن نے پیش کیا ہے، اس کے خلاف کوئی اور خیال آورائی دین کی اساس میں شامل کی جائے اور پھر اس بنیادی تغیر کے بعد ان عقائد اولیہ کے تقاضوں اور فرائض و واجباتِ دین میں کوئی کمی یا بیشی کی جائے۔ ان اساسی معتقدات اور ان کے صریح مقتضیات کو ہم نے دستور جماعت اسلامی میں پیش کر دیا ہے۔ جو گروہ قرآن کی نصوص قطعیہ سے مرتب کیے ہوئے اس دستور جماعت اسلامی کی حدود کے اندر ہیں، انھیں ہم امت مسلمہ کے اندر شمار کرتے ہیں، اور جن لوگوں نے ان حدود کو پھاندا ہے، انھیں دائرۂ امت کے باہر سمجھنے پر مجبور ہیں۔ ہاں ان حدود کے اندر رہتے ہوئے استنباطی اور اجتہادی امور میں جائز حد تک اگر کوئی گروہ کسی دوسرے گروہ سے جزئی اختلافات رکھتا ہے تو ایسے اختلافات آنحضورؐ کی ہدایات اور اسوۂ صحابہ کی روشنی میں جائز قرار دیے جائیں گے، بشرطیکہ ان اختلافات کو جداگانہ جماعت بندی اور امت سازی کا ذریعہ نہ بنایا جائے۔

سوال:۔ ایک شیعہ دوست جو آپ کے مداح اور جماعت اسلامی کے لٹریچر سے قدرے متعارف ہیں، نماز باجماعت کے متعلق عجیب مسلک رکھتے ہیں، یعنی میں ان کے پیچھے نماز پڑھنے کے لیے تیار ہوں، مگر وہ یہ عمل اختیار کرنے سے اس اصول کی بنا پر بھاگتے ہیں کہ امام نماز کو معصوم ہونا چاہیے۔ میں نے اس سلسلہ میں ترجمان القرآن کے بعض رسائل و مسائل میں سے کچھ اجزا انھیں نماز باجماعت کی اہمیت اور غیر معصوم امام کے پیچھے نماز پڑھنے کی گنجائش تسلیم کرانے کے لیے سنائے۔ مگر وہ کسی طرح نہیں مانتے۔ فرمایئے انھیں کس طرح سمجھاؤں۔

جواب:۔ امام معصوم کا عقیدہ جس نے شیعوں میں رواج پایا اور جس پر درحقیقت مسلک تشیع کی بنیاد قائم ہے اپنی اصل کے اعتبار سے نہ صرف یہ کہ بے اصل ہے، بلکہ شیطان کا ایک بہت بڑا دھوکا ہے، جس سے اس نے مسلمانوں کے ایک بڑے گروہ کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دین اور اس کے مطالبات اور اس کے مہمات کو عملاً معطل کر دیا ہے۔ اس نے امامت کے لیے معصومیت کی ایسی شرط لگائی جس کا متحقق ہونا اور دائماً و مستقلاً متحقق ہوتے رہنے غیر ممکن تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قرونِ ماضیہ میں بھی جبکہ شیعوں کے عقیدہ کے مطابق ائمۂ معصومین ظاہر ہوتے رہے، ہر امام کی وفات کے بعد اختلاف واقع ہوا کہ اس کی جگہ کونسا امام معصوم ہے اور اسی مسئلہ پر ہر امام کے بعد کئی کئی فرقے بنتے رہے اور بعد میں جب "آخری امام معصوم" غائب ہوئے تو کئی صدیوں سے عملاً دین کے تمام مہمات بلکہ وہ سارے کام جو دین کی اصلی روح ہیں، آج تک معطل چلے آ رہے ہیں، کیونکہ یہ سب کام امامِ معصوم پر منحصر ہیں اور امام معصوم غائب ہے۔ اگر اس پر شیعہ حضرات متنبہ نہیں ہوتے اور شیطانی دھوکہ میں مبتلا رہنا چاہتے ہیں تو ہمارے لیے اس کے سوا کیا چارہ ہے کہ صبر کریں اور ان کے حق میں دعائے خیر کرتے رہیں۔

سوال:۔ اگر کوئی شیعہ دستور جماعت اسلامی کے پورے مطالبات کو قولاً اور عملاً تسلیم کرلے تو کیا وہ شیعہ رہتے ہوئے جماعت اسلامی کا رکن بن سکتا ہے؟

جواب:۔ دستور جماعتِ اسلامی کے پورے مطالبات کو تسلیم کر لینے اور ان پر عمل پیرا ہو جانے کے بعد کوئی شخص شیعہ رہ ہی کہاں سکتا ہے۔ وہ تو پھر ویسا ہی خالص مسلمان ہو گا جیسے اس دستور کو تسلیم کرنے والے دوسرے اراکین ہیں۔ اور یہ کچھ شیعوں کے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہے۔ جو شخص بھی اس عقیدے کو ٹھیک ٹھیک سمجھ کر قبول کرے جس کی تشریح ہمارے دستور میں کی گئی ہے اس کے اوپر سے تمام فرقی لیبل آپ سے آپ اتر جاتے ہیں اور وہ نرا مسلمان رہ جاتا ہے۔

ہندو دوست کا خط اور جواب

ہماری تحریک سے دلچسپی لینے والے ایک ہندو کرمفرما کے ایک دو گرامی نامے مع جواب ترجمان القرآن کی گزشتہ اشاعتوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ کچھ عرصہ قبل وہ بعض اہم مسائل پر امیر جماعت سے گفتگو کرنے کے لیے مرکز میں تشریف لائے تھے۔ یہاں سے واپس ہونے کے بعد موصوف نے جماعتی لٹریچر کا مزید مطالعہ کیا ہے اور اسی مطالعہ کے تاثرات کے ماتحت ایک مفصل اور دلچسپ خط مرکز کو بھیجا ہے۔ جسے ذیل میں مع جواب درج کیا جا رہا ہے:۔

دیر کے بعد خط لکھ رہا ہوں۔ اس طویل غیر حاضری کی وجہ صرف یہ خیال تھا کہ آپ کی جملہ تصنیفات کو مطالعہ کرنے کے بعد اپنے خیالات کو آپ کی خدمت میں وضاحت سے پیش کر سکوں گا۔ سو اب آپ کی کلیات کا ایک مرتبہ سرسری مطالعہ کر چکا ہوں۔ فی الحقیقت اپنے مشن کے لیے جہاں تک اخلاص کا تعلق ہے، میں نے آپ کو شری .... کے بعد دوسرا اور آخری رہنما پایا ہے۔ "آخری" کا لفظ میں جان بوجھ کر استعمال کیا ہے۔ شری .... جی جنھیں میں موجودہ دور میں ہندوؤں کی عظیم ترین شخصیت سمجھتا ہوں، کی ذات بابرکات کے لیے اپنے دل میں انتہائی عقیدت رکھنے کے باوجود میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ ان کے مشن کی تکمیل ہندو قوم پر جا کر ختم ہوتی ہے۔ ہندو قومیت میں کونسے عناصر شامل ہیں یا ہندو پن کیا ہے؟ ــــ اس کی تسلی بخش تفسیر آج تک نہیں ہو سکی۔ گوشت خور بھی ہندو اور گوشت کا تارک بھی ہندو، وید مقدس کو ماننے والا بھی ہندو اور ویدوں کا منکر بھی ہندو، گئو کا پجاری بھی ہندو اور گائے کے چمڑے کے جوتے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بنانے والا اور گانے کے چمڑے کے سازو سامان سے گھر کو زینت دینے والا بھی ہندو، بتوں کا پجاری بھی ہندو اور بتوں کا کھنڈن کرنے والا بھی ہندو، آستک بھی ہندو اور ناستک بھی ہندو، کروڑوں دیویوں دیوتاؤں کا ماننے والا بھی ہندو اور توحید کا قائل بھی ہندو ـــــ جو قطعی ایک دوسرے کی ضد ہیں؛ بھائی پرمانند جی نے اسی لیے ہندو کی ایک دوحرفی تعریف کی ہے کہ "جو اپنے آپ کو ہندو سمجھتا ہے وہ ہندو ہے"۔ ویرساورکر نے پریٹکل طور پر یہ تشریح کی ہے کہ "جو اس دیش کو ماتری بھومی اور پنیہ بھومی سمجھتا ہے وہ ہندو ہے"۔ کچھ قوم پرست مسلمان اس ملک کو ماتری بھومی تو ماننے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں مگر پنیہ بھومی نہیں؛ تو اس طرح مسلمانوں کا سوال جوں کا توں رہا۔ اور ہندوستان میں یہی ایک مسئلہ ہے جس کے حل کرنے پر ملک کے بہترین دماغ لگے ہوئے ہیں۔ آپ نے جو حل اس کا تجویز کیا ہے وہ فی الواقع نہ صرف مسلمان، نہ صرف ہندو، نہ صرف ہندوستان، بلکہ تمام بنی نوع انسان کے لیے یکسانیت رکھتا ہے۔ چند ایک بنیادی اصول ہیں جن کے ماننے والے ایک طرف، نہ ماننے والے دوسری طرف۔ ایک دو ٹوک (Clear cut) واضح پالیسی ہے۔ (اسی لیے میں نے آپ کے لیے "آخری" کا لفظ اوپر استعمال کیا ہے)

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ آپ کی کلیات کا ایک نظر سے مطالعہ کر لیا ہے۔ آپ نے جو خطبات تعلیمی درسگاہوں میں پڑھے ہیں اور موجودہ یونیورسٹیوں کو قتل گاہوں (Slaughter Houses) سے مناسبت دے کر حقیقت کا اظہار فرمایا ہے، اس تلخ صداقت کو بے نقاب کر کے آپ نے جس اخلاقی جرأت اور دلیری کا ثبوت دیا ہے، اس کی جس قدر تعریف کی جائے، کم ہے۔ میں آپ کے ان خطبات کا جب ان کانووکیشن ایڈریسز سے موازنہ کرتا ہوں جو ملک کے چیدہ چیدہ نامور ہستیوں نے، جن کے نام کے ساتھ بڑے بڑے سائن بورڈ چسپاں دئے گئے ہیں، تو یقین فرمایئے، میری طبیعت متلانے لگتی ہے۔

ایک طرف آپ کا قرآن کریم سے روشنی لے کر انسان کی فلاح کی خاطر اسلام کو روشناس کرانے کے لیے دعوت عام دینا اور چھوٹے چھوٹے ٹریکٹوں "سلامتی کا راستہ"، "دین حق"، "اسلام کا سیاسی نظریہ"، "اسلام کا اخلاقی نقطۂ نظر" وغیرہ لٹریچر کی اشاعت سے ذہنی انقلاب پیدا کرنا میرے سامنے ہے اور دوسری طرف میں دیکھتا ہوں کہ میری قوم کے لیڈر راستی سے بھٹک کر ادنیٰ مقاصد (Minor Issues) پر اپنی اور ساری قوم کی قوت ضائع کر رہے ہیں۔ ایک طرف آپ کا خطبات جمعہ تحریر کر کے ایک ایک مسجد میں اپنے نصب العین کو عوام تک پہنچانے کی سبیل پیدا کرنا ہے اور دوسری طرف ہندوؤں کے گوسوامی گنیش دت اور پنڈت مدن موہن مالوی بنارس ہندو یونیورسٹی میں مندر کی تعمیر کے لیے لاکھوں روپیہ اکٹھا کرنے کی فکر میں گھلے جا رہے ہیں۔ آریہ سماج کے بارے میں تو میرا یہ عقیدہ ہے کہ اگر آج رشی دیانند کا ظہور ہو تو وہ سب سے پہلے آریہ سماج کا سدھار کریں۔ کانگریس کے ہندو رہنماؤں کے بارے میں ایک مرتبہ لاہور کے عام جلسہ میں چوہدری خلیق الزماں سابق صدر یو۔ پی مسلم لیگ نے فرمایا تھا کہ ہندوؤں کے بڑے سے بڑے سیاسی لیڈر پنڈت جواہر لال نہرو سے زیادہ سیاست میرا کوچوان جانتا ہے۔ ٹھیک یہی بات بھائی پرمانند جی فرماتے ہیں کہ ہندوؤں کی بدقسمتی سے شروع سے ہی کانگریس کی ایسے ہندو لیڈروں کے ہاتھوں میں سیاست کی باگ ڈور رہی ہے جو ہندوستان کے مسلمانوں کے سامنے سیاست کے میدان میں طفل مکتب ہیں۔ جب میں ان حالات پر غور کرتا ہوں تو شاعر کے یہ الفاظ ایک آہ سرد بن کر بے ساختہ زبان سے نکل جاتے ہیں:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"یاسیت کی گردن میں لپٹا ہوا

راستہ تاریک، ویراں اور اداس

زندگی بے کیف و رنگ و نور ہے! کارواں منزل سے کوسوں دور ہے!"

جہاں تک میری ذاتی رائے کا تعلق ہے۔ میں بلا مبالغہ عرض کروں گا کہ آپکے پروگرام نے ملک کی دیگر تمام تحریکوں پر سایہ (Shade) ڈال لیا ہے۔ آپ کا سارا لٹریچر دیکھ جانے کے بعد مجھے بجز ایک کے اور کوئی بھی مسئلہ ایسا نظر نہیں آیا جس میں دیانت داری کے ساتھ آپکے اختلاف کر سکوں۔ مانتا ہوں کہ آپ کا پروگرام ہر پہلو سے مکمل (ComPlete) اور خود کفایت (Self Sufficient) ہے۔ صرف دو باتیں جو مجھے کھٹکتی ہیں، جناب کی خدمت میں عریاں پیش کرنے کی جرأت کرتا ہوں۔

آپ کی تصنیف الجہاد فی الاسلام کے مطالعہ کے بعد میرا یقین تھا کہ سنسکرت زبان پر آپ کا عبور ایک لازمی چیز ہے۔ مگر اُس شام سیر کے وقت دوران گفتگو میں آپ کا یہ فرمانا کہ آپنے سب کچھ ویدوں کے بارے میں انگریزی کتابوں سے لیا ہے۔ سچ سچ مجھے یہ جملہ سن کر ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی شخص برقی رو کے چھو جانے سے جھٹکا سا محسوس کرتا ہے جیسے آپ نے فرمایا تھا کہ ایچ۔ جی۔ ویلز کا اسلام کے بارے میں براہ راست کیا علم ہے جو انھوں نے اسلام اور حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پاکیزہ زندگی پر بے معنی نکتہ چینی کر کے رکھ دی۔ بعینہٖ آپ کا سنسکرت زبان سے براہ راست تعلق نہ ہونے کی وجہ سے وید بھگوان کے بارہ میں آپ کے احساسات مستند نہیں کہے جا سکتے۔ آپ تسلیم کریں گے کہ ایک زبان سے دوسری زبان میں آزادانہ ترجمہ کرنے پر بھی اصل منشا پورا نہیں ہوتا، چہ جائیکہ اسے پھر تیسری زبان میں پیش کیا جائے۔ رشی دیانند نے تو مہی دھر اور ساین آچاریہ کے وید بھاشیہ کو بھی لغو ٹھیرا دیا ہے، پھر کہاں آپ "میکس مُلر" اور دیگر یورپین اصحاب کے ترجمے سے رائے قائم کرتے ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی ان نیک اور بلند خواہشات کا جو آپ ہندوؤں کے دل و دماغ سے تعصب دور کر کے انھیں اسلام سے صحیح طور پر روشناس کرانے کے لیے اپنے دل میں رکھتے ہیں، احترام کرتے ہوئے میں مودبانہ یہ گذارش کروں گا کہ آپ آئندہ اپنی ان کتابوں پر نظر ثانی فرماتے وقت، جن میں خاص طور پر ہندو لٹریچر کے حوالے (Referencts) پائے جاتے ہیں، کسی ایسے شخص کی امداد حاصل کریں جو ہندو ابھیاس اور ہندو لٹریچر پر براہ راست عبور رکھتا ہو۔ (مجھے ذاتی طور پر ایسے ایک دو اصحاب سے قربت کا فخر حاصل ہے) امید ہے آپ کی ذات مبارک پر میرا منشا واضح ہو گیا ہو گا۔

آپ نے رسالہ "اسلام اور جاہلیت" کے آخر میں یہ فرمایا ہے کہ "تاریخ شاہد ہے کہ جیسے افراد اس نظریے پر تیار کیے گئے تھے نہ ان سے بہتر افراد کبھی روئے زمین پر پائے گئے، نہ اس اسٹیٹ سے بڑھکر کوئی اسٹیٹ انسان کے لیے رحمت ثابت ہوا۔" اگر صاف گوئی پر معاف فرمایا جائے تو میں نہایت ادب و انکسار سے گذارش کروں گا کہ آپنے یہاں طرف داری سے کام لیا ہے۔ یہاں تعصب کی جھلک نظر آتی ہے۔ میں صرف ایک بھگوان کرشن کی شخصیت پیش کروں گا جن کی دو حرفی تقریر ہے کہ

"فعل سے وابستگی واجب نہیں تیرے لیے فرض کی تکمیل کر، خواہش صلہ کی چھوڑ دے"

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ویرارجن جیسے مجاہد پر ایک ہیبت کا عالم طاری کردیا۔ اور اس کے بازو میں برقی طاقت پیدا کردی۔ اور اس تاریخی واقعہ کی یادگار میں گیتا جیسی ممتاز کتاب ظہور میں آئی۔ بڑے بڑے مخالف بھی کرشن بھگوان کی زندگی میں کوئی اخلاقی رخنہ دکھا نہ پیش کرسکے۔ "بھگوان" کا لفظ میں نے صفتی معنوں میں لیا ہے، اوتار کے معنوں میں نہیں۔ آپ نے ایسی شخصیتوں کو نظر انداز کرکے اسلام سے پہلے کی تاریخ کے معاملہ میں تعصب کا ثبوت دیا ہے۔ سچ بات تو یہ ہے کہ میری آنکھیں ترستی رہیں کہ آپ کسی جگہ کسی ہند وکیرکٹر کا نمونہ پیش کریں، مگر اے بسا آرزو کہ خاک شدہ!

آپ نے ترجمان القرآن میں میرے خطوط اور اپنے جوابات شائع فرماکر اسلامی پریس کے لیے دلچسپی کا سامان مہیا کردیا۔ دہلی کا ایک روزنامہ "حکومت الٰہیہ اور پاکستان" کے عنوان سے ان خطوط کا حوالہ دے کر آپ پر خوب برسا ہے۔ عجیب منطق ہے کہ دیدہ دانستہ عین اسلامی تعلیم کو جھٹلایا جارہا ہے!!

مرحوم مولانا محمد علی صاحب نے ایک دفعہ فرمایا تھا کہ "جہاں تک مسلمانوں کے ایمان کا تعلق ہے۔ میں ایک فاسق و فاجر مسلمان کو گاندھی جی سے بہتر سمجھتا ہوں"۔ لیکن آپ نے اصل اسلام پیش کرکے اور مسلمانوں کی ایمانی قوت کو الم نشرح کرکے نہ صرف مسلمانوں کی، بلکہ تمام انسانیت کی زبردست خدمت انجام دی ہے۔ آپ کے اسلامی لٹریچر کے طفیل وہ محسوس کررہے ہیں کہ انھیں کیا ہونا چاہیے تھا اور کیا ہوگئے ہیں۔ مگر میری گذارش یہ ہے کہ جب آپ کی حکومت الٰہیہ ہر فرد و بشر کے لیے انسانیت کے ناطے سے یکساں جاذبیت رکھتی ہے اور آپ کا منشا بھی یہی ہے کہ بہ لحاظ مذہب و ملت اسے عوام تک پہنچایا جائے پھر آپ اپنی مساعی (Struggle) کو صرف مسلمانوں تک کیوں محدود رکھتے ہیں"۔

جواب:۔ آپ کا یہ اعتراض صحیح ہے کہ میں نے سنسکرت زبان اور ہندوؤں کی مذہبی کتابوں سے براہ راست واقفیت کے بغیر محض یورپین ترجموں کے اعتماد پر اپنی کتاب میں ویدوں سے کیوں بحث کی، لیکن آپ نے اس بات کا خیال نہیں کیا کہ الجہاد فی الاسلام بالکل میرے ابتدائی عہد کی تصنیف ہے جب مذاہب کے معاملہ میں میرا روییہ پوری طرح پختہ نہیں ہوا تھا اور نہ وہ احتیاط طبیعت میں پیدا ہوئی تھی جو تحقیق کے لیے ضروری ہے۔ اب اگر میں اس کتاب کو دوبارہ لکھوں گا تو ہر اس چیز کی جس کی براہ راست واقفیت کا موقع مجھے نہیں ملا ہے، از سر نو تحقیق کروں گا۔ آپ اگر اس تحقیق میں میری کچھ مدد کرسکتے ہیں تو میں آپ کا بہت شکرگذار ہوں گا۔ کوئی ہندو عالم جو خود بھی محض حامی دین (Defender of the faith) نہ ہو، بلکہ خود محقق بھی ہو اور محققانہ انصاف بھی اپنے اندر رکھتا ہو، اگر میری کتاب کے اس حصے پر جو ہندوؤں سے متعلق ہے، تنقید کرکے مجھے بتائے کہ میں نے کہاں کہاں غلطی کی ہے تو اس سے مجھے بہت مدد ملے گی۔ اس کے علاوہ اگر آپ مجھے کوئی ایسی کتاب بتائیں جس میں ہندو مذہب کے مقصد جنگ اور قوانین جنگ کو بناوٹ کے بغیر، جیسے کہ بجائے خود وہ ہیں، پیش کیا گیا ہو تو مزید باعث شکرگذاری ہوگا۔ "بناوٹ کے بغیر" کی شرط میں اس لیے لگا رہا ہوں کہ آج کل عام طور پر لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ ایک مذہب پر جیسا کہ وہ بجائے خود ہے، ایمان نہیں رکھتے۔ مگر قومی عصبیت کی خاطر اس مذہب کو اپنے مذہبی طرز عمل ( ) کو "معقول" ( ) بنانے کے لیے وہ اکثر جو جو نظریات کے مطابق ایک نیا مذہب گھڑتے ہیں اور پرانے مذہب کے نام سے اسے پیش کرتے ہیں۔ مجھے اس طریقہ سے سخت نفرت ہے خواہ اسے مسلمان برتیں یا ہندو یا کوئی اور۔ میرا خود بھی یہ طریقہ ہے اور میں پسند بھی صرف ایسے ہی لوگوں کو کرتا ہوں جو اصل مذہب کو۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جیسا کہ فی الواقع وہ ہے، ویسا ہی رہنے دیں اور ویسا ہی اسے پیش کریں، پھر اگر وہ ماننے کے لائق ہو تو اسے مانیں اور ماننے کے لائق نہ ہو تو اسے رد کر دیں۔

دوسری چیز جس کی آپ نے شکایت کی ہے، اس پر آپ کو بجائے مجھ سے شکایت کرنے کے خود ہندوؤں سے شکایت کرنی چاہیے تھی اور مجھے بھی اس معاملہ میں ان سے شکایت ہے۔ انھوں نے خود اپنے بزرگوں کی سیرتوں کو محفوظ نہ رکھا بلکہ ان کی حقیقی زندگیوں کو افسانوں سے خلط ملط کر دیا۔ اس سے بھی زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ یہودیوں کی طرح انھوں نے بھی اپنی اخلاقی کمزوریوں کو درست ثابت کرنے کے لیے بدترین اخلاقی کمزوریاں اپنے بزرگوں کی طرف منسوب کر دیں۔ اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ ہندوستان کے جن بڑے بڑے اشخاص کی طرف نگاہیں اس توقع سے اٹھتی ہیں کہ انھیں اخلاقی پاکیزگی اور عظمتِ انسانیت کے نمونے کی حیثیت سے لیا جاسکے گا، ان کے واقعاتِ زندگی تاریخی حیثیت سے مشتبہ بھی ہیں اور افسانویت سے آلودہ بھی، اور جن مآخذ کی سند سے ان کے روشن پہلو ہمارے سامنے آتے ہیں انھیں کی سند سے ایسے تاریک ترین پہلو بھی آتے ہیں جنھیں کسی بڑے انسان کی طرف منسوب کرنا تو درکنار کسی گھٹیا انسان کی طرف منسوب کرتے ہوئے بھی شرم محسوس ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے، نہ کہ کسی قومی یا مذہبی تعصب کی وجہ سے میں مجبور ہوں کہ تاریخ کے صرف ایک ہی دور کو کمالِ انسانیت کے نمونے کی حیثیت سے پیش کرتا ہوں کیونکہ وہ تاریخی حیثیت سے نہایت معتبر بھی ہے۔ افسانویت کا اضافہ کرنے کی اگر اس میں کوشش کی بھی گئی ہے تو تاریخی تنقید کے ایسے ذرائع موجود ہیں جن سے اس آلودگی کو پورے منصفانہ طریقے سے چھانٹ کر الگ کیا جاسکتا ہے، اور پھر وہاں کسی اخلاقی گندگی کا تو سرے سے نام و نشان ہی نہیں ملتا۔ یہ تو خدا کی دین ہے جس کے نصیب میں آجائے۔ اگر عرب نسل کے ایک مختصر گروہ کو یہ فضل نصیب ہو گیا تو اس پر کسی افسوس کی ضرورت نہیں اور نہ افسوس کرنے سے کچھ حاصل ہے۔ بلکہ اگر آپ ہندوستانی یا ہندو کے نقطۂ نظر سے دیکھنے کے بجائے انسانی نقطۂ نظر سے دیکھیں تو انسانیت کے لیے جو چیز قابلِ فخر ہے، اس پر آپ کو بھی اسی طرح فخر کرنا چاہیے جس طرح ایک عرب فخر کرسکتا ہے۔ کیونکہ انسانیت کے نقطۂ نظر سے جو تاج کسی انسان یا کسی انسانی گروہ کو پہنایا گیا، وہ ہم سب انسانوں کے لیے تاجِ فخر ہی ہے، خواہ وہ کسی عرب انسان کے سر پر نظر آئے یا ہندوستانی انسان کے سر پر!!

النظر فی الحدیث کا ضرور مطالعہ کیجیے

اردو زبان میں اصولِ حدیث کے فن کی یہ نہایت ہی نادر الوجود اور بے نظیر کتاب ہے۔ اس میں قدما اور متاخرین محدثین محققین کی بے شمار عربی کتابوں سے ان تمام اصولِ روایت اور اصولِ درایت کو مولانا ابو سعید صاحب جھکاوی نے نہایت عمدہ ترتیب اور تفصیل سے ایک جگہ جمع کیا ہے۔ جس کے مطالعہ سے صحیح حدیثوں میں غیر صحیح میں آسانی کے ساتھ تمیز حاصل ہو جاتی ہے۔ اس کا بھی صاف انکشاف ہو جاتا ہے کہ علوم فلسفہ اور سائنس سے کون حدیثیں موافق اور کون مخالف ہیں۔ یہ بات بھی ظاہر ہو جاتی ہے کہ مختلف فرقے اپنے مسائل کا کن کتبِ حدیث اور کس قسم کی حدیثوں سے استدلال کرتے ہیں۔ قیمت ؏ علاوہ محصول ڈاک۔ پتہ:- انجمن حزب الاسلام مقام و ڈاکخانہ مصطفیٰ آباد ضلع سارن۔

© rasailojaraid.com

مطبوعات

تدوین فقہ۔ از مولانا سید مناظر احسن گیلانی، صدر شعبۂ دینیات، جامعۂ عثمانیہ۔ مطبوعہ مجموعۂ تحقیقات علمیہ جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن۔ قیمت معلوم نہیں۔

تدوین فقہ کے عنوان سے مولانا سید مناظر احسن صاحب کا ایک سلسلۂ مضامین بعض رسائل میں نکل چکا ہے۔ وہی مضامین اس رسالہ میں یکجا شائع کر دیے گئے ہیں۔ اگرچہ یہ سلسلہ ابھی نامکمل ہے تاہم تقریباً سوا سو صفحے کا ٹائپ میں چھپا ہوا اچھا خاصہ رسالہ ہے۔ علماء کی تصنیفات میں سائنٹفک ترتیب نہیں ہوتی، اس وجہ سے ان لوگوں کو ان کی کتابوں سے اخذ مطلب میں زحمت ہوتی ہے جو تھوڑی فرصت میں کسی کتاب کے مالہٗ وما علیہ کو سمجھنا چاہتے ہیں تاہم ان کے بیان میں ایک وسعت ہوتی ہے جو ان کے طرز تحریر کی غرابت کے باوجود ان کی وسعت مطالعہ کی وجہ سے دلچسپ اور مفید بن جاتی ہے۔

اس رسالہ کی تمہید اچھی ہے۔ مولانا نے جس نہج سے اس کو اٹھایا تھا اگر اسی نہج سے اس کو بڑھانے کی کوشش کرتے اور اصل موضوع دوسری بحثوں میں گم نہ ہو جاتا تو یہ نہایت مفید رسالہ بنجاتا اور وقت کے بعض اہم شبہات کو دور کرنے میں مدد دیتا لیکن مولانا اپنے قلم کی روانی میں اکثر اصل بحث کے سررشتہ کو بھول کر دوسری بحثوں میں نکل جاتے ہیں اور اس طرح کی ژولیدہ بیانی اور بے ربطی کے ساتھ اپنے کلام کی افادیت کو ابن تیمیہ کے سوا کوئی اور باقی نہیں رکھ سکا۔

اس رسالہ میں بعض باتیں خاص طور پر قابل توجہ نظر آئیں مثلاً ایک یہ بحث کہ خبر احاد کو شہرت سے بچانا اور ان کو صرف افراد ہی کے اندر ہی محدود رکھنا خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش نظر تھا اور خلفائے راشدین نے باقاعدہ ایک اسکیم بنا کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس منشا کو پورا کرنے کی کوشش کی۔ حضرت ابوبکر صدیق نے اپنی جمع کردہ روایات کا مجموعہ جو جلا دیا اور حضرت عمرؓ نے کثرت روایات سے جو لوگوں کو کھلم کھلا روکا اور بسا اوقات سزائیں تک دیں تو اس کی وجہ یہی تھی کہ جن باتوں کو پیغمبر شہرت عام کا درجہ نہیں دینا چاہتے تھے اس روک تھام کے بغیر اندیشہ تھا کہ وہ افسانۂ بزم و انجمن بنجائیں۔ مولانا کے خود اپنے الفاظ یہ ہیں:۔

> "ان الفاظ سے یہ ظاہر ہو رہا ہے کہ جن راویوں کو خبر واحد ہونے کی حیثیت سے عن الخاصہ سے مستثنیٰ فرمانا پیغمبر نہیں چاہتے تھے ڈر تھا کہ عن العامہ کی شکل اختیار کریں گی یعنی اگر صحابہ ہی میں بکثرت روایت کرنے والے ان حدیثوں کے پیدا ہو جائیں گے تو نبوت جن مطالبات میں خفت پیدا کرنا چاہتی ہے ان میں اسی قسم کی شدت آئندہ چل کر پیدا ہو جائے گی جیسے صرف قرآنی مطالبات اور ان کی تفصیلات و عملی تشکیلات تک قصداً محدود رکھنے کی کوشش کی گئی ہے جن کی تعمیل عام حالات میں ہر مسلمان کے لیے ناگزیر اور ضروری ہے۔"

مولانا کا مطلب یہ ہے کہ یہ بات کچھ مشکل نہ تھی کہ آنحضرت صلعم کے تمام ارشادات اور اعمال بھی اس طرح شہرت اور تواتر قولی و عملی کا درجہ حاصل کر لیں جس طرح قرآن، نماز، نجوقتہ اور ارکان حج وغیرہ نے اختیار کر لیا لیکن آنحضرت صلعم نے یہی چاہا کہ آپ کی یہ تعلیمات عام نہ ہوں تاکہ لوگوں کے لیے ان میں ڈھیل باقی رہے اور لوگ ان کے ضعف، عدم شہرت، راوی کی غلط فہمی، سوء حفظ وغیرہ کے

© rasailojaraid.com

اندیشوں کی بنا پر ان پر گفتگو نہیں کریں اور بعض حالات میں ان کو چھوڑ کر مختلف راہیں اختیار کر سکیں اور ہر طرح کے لوگوں کے لیے دین کے دائرہ میں گنجائش پیدا ہو جائے۔ چنانچہ مولانا فرماتے ہیں:۔

"سچ تو یہ ہے کہ اسلام سے جو لوگ قصداً و اختیاراً ہی نکلنے پر آمادہ ہوں ان کوتاہ نصیبوں کا تو کوئی علاج نہیں ورنہ یہ کہنا شاید غلط نہ ہوگا کہ جو اسلام کے دائرہ میں جینا اور مرنا چاہتا ہے وہ پائے گا کہ گنجائشوں کے پیدا کرنے میں اسلام نے کوئی کمی نہیں کی ہے۔"

ان گنجائشوں کی نوعیت کو خود مولانا کے الفاظ میں مثالوں سے سمجھ لیجئے۔

"حنفی مذہب کی عام کتابوں میں مذکورہ بالا امور اور ان کے سوا بھی اس کے دیگر متعلقات کے باب میں جو متفرق چیزیں نشہ آور عرقیات و مشروبات کے متعلق ملتی ہیں اور مالکی مذہب کا جو توسیعی نقطۂ نظر اکولات کے متعلق ہے اگر ان کو سامنے رکھ لیا جائے جو ظاہر ہے کہ انسانی زندگی کا ایک جزئی و جزئی مسئلہ ہے۔ لیکن ایسے ممالک جیسے شمالی و جنوبی قطب کا حال ہے سنا جاتا ہے کہ وہاں کے باشندوں کی گذر اوقات صرف مچھلیوں پر ہے یا اگر مچھلی نہ ملی تو دوسرے بحری جانوروں کے کھانے پر مجبور ہیں۔ اگر یہ قوم مسلمان ہونا چاہے تو کیا غذائی حیثیت سے وہ مالکی مذہب کی اکولاتی وسعتوں سے نفع اٹھا کر اسلام کے دائرہ میں اپنے آپ کو باقی نہیں رکھ سکتی یا نشہ آور عرقیات کے سلسلہ میں آج مغربی تمدن کے تسلط کی بدولت دواؤں میں، رنگوں میں، وارنش میں اور بھی مختلف چیزوں میں الکحل کے استعمال کا عمومی ابتلا جو پایا جاتا ہے جن میں غیروں کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے عوام کی بھی ایک بڑی تعداد دنیا کے اکثر حصوں میں شریک ہے جیسا کہ سنا جاتا ہے کہ الکحل کا یہ جوہر عموماً غیر خمری عرقوں سے نکالا جاتا ہے اور کلیتہً یہ نہ بھی صحیح ہو جب بھی ہر قسم کے الکحل کا خالص خمری عرقیات ہی سے تیار ہونا یقیناً غیر ضروری ہے ایسی صورت میں یہ جانتے ہوئے کہ ہمارے مذہب میں الکحل قطعاً حرام و نجس ہے مسلمانوں میں جو لوگ اس کے استعمال میں لاپروائیوں بلکہ بسا اوقات مخالفانہ اصرار و تمرد سے کام لے کر جس عصیان بلکہ بغاوت کے مرتکب ہو رہے ہیں کیا الخمر کے متعلق جو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا نقطۂ نظر ہے اور حنفی مذہب میں اس کے متعلق جو تفصیلات پائی جاتی ہیں ان کو پیش نظر رکھ کر ان مسلمانوں کے جرم کو کیا ہلکا نہیں بنایا جا سکتا۔"

اس اقتباس کے بعد مولانا کا منشا بالکل واضح ہو گیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفاء اگر روک تھام نہ کرتے اور تمام حدیثیں شہرت و استفاضہ کے درجہ تک پہنچ جاتیں تو اس سے سب سے بڑی قیامت تو اس امت پر ٹوٹ پڑتی کہ مذہبی اختلافات اور فقہی مسالک و مذاہب کا دروازہ ہی بند ہو جاتا جو عین رحمت کا دروازہ ہے جس سے ہر قوم اور ہر ملک کے لوگ اسلام کے دائرہ کے اندر داخل ہو سکتے ہیں نیز دوسری مصیبت یہ پیش آتی کہ اس زمانہ کے لوگ جو اپنے نفس کی خواہشوں کی پیروی میں بسا اوقات دین سے بے پروائی بلکہ عصیان و تمرد کی صورت اختیار کر لیتے ہیں ان کا دین سے رشتہ ہی کٹ جاتا۔ یہ محض خبر احاد کی عدم شہرت ہی کی برکت ہے کہ جزئیات دین میں کوئی شدت نہ پیدا ہوئی۔ نیز اس کی وجہ سے دین میں اختلافات پیدا ہوئے اور ہر باب میں اتنے مذاہب و اقوال پیدا ہو گئے کہ آج ہم چاہیں تو خدا کے کسی بڑے سے بڑے باغی کی نافرمانیوں کے لیے فقہ کے جزئیات سے کوئی نہ کوئی سند جواز ڈھونڈھ کر اس کی بغاوت کو عبادت بنا دے سکتے ہیں ورنہ کم از کم اس کے جرم کو ہلکا تو کر ہی دے سکتے ہیں۔ مولانا نے اس سلسلہ میں ایک لمبی بحث

© rasailojaraid.com